علمی و تحقیقی مجلہ

ثقافتی قونصلیٹ سفارت اسلامی جمہوریہ ایران۔ اسلام آباد

پیغامِ آشنا

جلد ۲۲، شمارہ ۸۸، سال ۲۰۲۲ء
(جولائی تا ستمبر)

ISSN: 2079-4568

بسم الله الرحمن الرحیم

اہم گزارشات

- ایران اور پاکستان صدیوں سے دوستی اور اخوت کے بے شمار رشتوں میں منسلک ہیں۔ پیغام آشنا کے اجراء کا مقصد ان دونوں ملکوں کے درمیان اس خطے کی مشترکہ علمی، ادبی، تاریخی اور ثقافتی میراث کو محفوظ اور مستحکم بنانا ہے۔
- پیغام آشنا ایچ۔ای۔سی سے منظور شدہ تحقیقی مجلہ ہے جس میں فارسی اور اردو زبان و ادب کے حوالے سے غیر مطبوعہ مقالات ''ایچ ای سی'' کے طے کردہ ضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔
- مقالے کا ''ایچ ای سی'' کے مجوزہ روش تحقیق اے، پی اے (APA) پر مشتمل ہونا لازمی ہے۔
- تمام مقالات مجلس مشاورت کی منظوری کے بعد شائع کیے جاتے ہیں۔
- اشاعت کے لیے قبول کیے جانے والے مقالات میں ادارہ ضروری ادارتی ترمیم، تنسیخ اور تلخیص کا حق محفوظ رکھتا ہے۔
- مقالہ ارسال کرتے ہوئے درج ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے جو کہ آج کے ترقی یافتہ علمی دنیا میں بالعموم رائج ہیں۔ مقالہ اے فور جسامت کے کاغذ پر ایک ہی جانب کمپوز کروا کر بھیجا جائے۔ مقالے کے ساتھ اردو اور انگریزی زبان میں خلاصہ (Abstract) (تقریباً ۱۰۰ الفاظ) کلیدی الفاظ اور عنوان ضرور شامل کیا جائے۔ مقالے کی سی ڈی بھی ساتھ ضرور ارسال فرمائیں۔ یعنی مقالہ کی ''ہارڈ'' اور ''سوفٹ'' کاپی دونوں ارسال کی جائیں۔
- مقالہ کے عنوان کا انگریزی ترجمہ، مقالہ نگار کے نام کے انگریزی ہجے اور موجودہ عہدہ، نیز مکمل پتہ، برقی پتہ اور فون نمبر درج کیا جائے۔

ہائیر ایجوکیشن کمیشن پاکستان سے منظور شدہ

سہ ماہی

پیغامِ آشنا

جلد۔۲۲،شمارہ۔۸۸، سال ۲۰۲۲ء

(جولائی تا ستمبر)

مدیر اعلیٰ

احسان خزاعی

مدیر(اعزازی)

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

ثقافتی قونصلیٹ

سفارت اسلامی جمہوریہ ایران۔ اسلام آباد

مکان نمبر ۲۵،گلی نمبر ۲۷،ایف ۲/۶،اسلام آباد۔

فون نمبر :۸۔۷۹۳۷ ۲۸۲ ۰۵۱ فیکس ۲۸۲۷۱۷۷۴ ۰۵۱

برقی پتہ: iran.council@gmail.com,payghameashna@gmail.com

ویب سائٹ:http://ur.icro.ir/IslamAbad

Facebook address: https://www.facebook.com/raiezani/

ISSN:2079-4568

مجلس ادارت

افتخار عارف، سابق ڈائریکٹر جنرل، ادارہ فروغ اردو، اسلام آباد

پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم اختر، سابق استاد قائداعظم یونیورسٹی۔ اسلام آباد

ڈاکٹر ہلال نقوی، پاکستان اسٹڈی سنٹر، کراچی یونیورسٹی، کراچی

ڈاکٹر محمد اکرم اکرام، صدر، اقبال چیئر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر مہر نور محمد خان، سابق صدر، شعبہ فارسی، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر محمد یوسف خشک، چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد

ڈاکٹر شگفتہ موسوی، سابق صدر شعبہ فارسی، نمل اسلام آباد

ڈاکٹر محمد سفیر، سابق صدر شعبہ فارسی نمل۔ اسلام آباد

مجلس مشاورت

ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم، صدر، شعبہ اردو، الازہر یونیورسٹی، قاہرہ، مصر

ڈاکٹر حیدر رضا ضابط، اسلامی تحقیقی مرکز، آستان قدس رضوی، مشہد، ایران

ڈاکٹر خلیل طوق آر، صدر، شعبہ اردو، انقرہ یونیورسٹی، استنبول، ترکی

پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود خٹک۔ صدر، شعبہ اردو، جامعہ بلوچستان۔ کوئٹہ

پروفیسر سحر انصاری، انجمن ترقی اردو، کراچی

ڈاکٹر عبداللہ جان عابد، صدر، شعبہ پاکستانی زبانیں، علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر عراق رضا، صدر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ہندوستان

ڈاکٹر علی بیات، صدر، شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی، تہران

ڈاکٹر مقصود الٰہی شیخ محقق، دانشور، بریڈفورد، انگلستان

ڈاکٹر محمد ناصر، صدر، شعبہ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر نجیبہ عارف، ڈین، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

فہرست

اداریہ		
پاکستان میں عصر حاضر کی، چند فارسی گو شاعرات	مسرت واجد	۸
خراسان سے برصغیر تک (سلسلہ چشتیہ کا مختصر تعارف)	شوکت حیات/محمد اکرم	۳۰
سندھ کے فارسی کتب تواریخ کا اجمالی جائزہ	مرزا کاظم رضا بیگ	۳۹
نور شاہ جہان انور کے پشتو نثری آثار میں فارسی اشعار کے حوالے	اصل مرجان محب وزیر	۴۶
علامہ اقبال، سکھ اور سکھ مذہب	زیب النساء سرویا	۵۲
سیالکوٹ میں فارسی ادب کے چند درخشندہ ستارے	اکبر علی غازی/افتخار احمد سلہری/سونیا اللہ رکھا	۸۴
نثری داستانی ادب میں اسلوبی میلانات و رجحانات	ثمینہ سیف/نسیمہ رحمٰن	۱۰۸
کلام مظہر الدین مظہر : فکری و فنی مباحث	خالد محمود/محمد اعجاز تبسم	۱۲۰

★★★

اداریہ

ایران کی تاریک اس بات کی گواہ ہے کہ یہ سرزمین ہزاروں سال سے علم و ادب، عرفان و فلسفہ، خط و موسیقی اور سائنسی علوم کی آماجگاہ رہی ہے۔ انقلاب اسلامی کے بعد بھی یہ روایت مکمل طور پر برقرار ہے۔ ایران میں آج بھی فن خطاطی، مصوری، موسیقی، شعر و ادب اور ان کے ساتھ ساتھ علوم قرآنی، اسلامی اور کھیلوں کی نمایاں پذیرائی اور ترویج کا سلسلہ جاری ہے۔ مختلف مناسبتوں سے ان تمام شعبوں میں ملکی اور بین الاقوامی مقابلوں اور تقاریب اور عظیم الشان فیسٹول کا انعقاد ہوتا ہے۔ جن میں باقاعدہ انعامی مقابلے ہوتے ہیں اور بھاری انعامات پیش کئے جاتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ان فنون سے صرف ان شعبوں سے متعلق افراد کی وابستگی ہو بلکہ ہر شہری اپنے زوق کے مطابق کسی نہ کسی فن کو سیکھتا ہے اور اس میں مشق کرتا ہے۔ یعنی ایک خانہ دار خاتوں ایک اچھی مصورہ، شاعرہ یا خطاط ہوگی۔ ایک دوکاندار، ایک ٹیکسی ڈرائیور ایک وکیل، ایک ڈاکٹر، ایک انجنیئر اپنے پیشے کے ساتھ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کسی نہ کسی ایک فن میں مہارت رکھتا ہوگا۔

آپ کسی ٹیکسی میں سوار ہونگے اور ان سے گفتگو کریں گے تو ممکن ہے کہ وہ آپ کو حافظ، فردوسی یا سعدی اور خیام کے اشعار سنائے۔ اسی طرح ہر شعبہ زندگی سے متعلق افراد کسی نہ کسی فن اور ہنر سے وابستگی رکھتے ہیں۔

ہنر اور ادب سے تعلق نہ صرف انسان کی ذہنی اور دلی تسکین کا باعث بنتی ہے بلکہ اس طرح ہر فرد معاشرے کے لئے بھی ایک معقول، معتدل اور مثبت کردار بن کر سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ ذہنی اور فکری خلفشار سے محفوظ رہتا ہے۔

ایران کے اکثر شہروں میں آرٹ اور فنون کی اکیڈمیاں اور کالجز حکومتی سرپرستی میں کام کرتی ہیں جبکہ پرائیوٹ ادارے تو بے تحاشا ہیں ۔حتی سبکدوش افراد لے لئے ادارے اور مراکز قائم ہیں جہاں وہ شام کو علمی ، ادبی اور ثقافتی مصروفیات میں صحت منداور پرسکون رہنے کی مشق کرتے ہیں ۔ایران کی لائبریریاں کتاب بینی اور تحقیقی مقاصد کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی نشستوں کے مراکز بھی ہیں ۔

میری دانست میں اگر اس طرح کے اقدامات ہمارے عزیز ملک پاکستان میں بھی اٹھایے جائیں تو بلاشبہ یہاں بھی عدم تشدد اور رواداری کی فضا با آسانی قائم ہوگی کیونکہ یہ سرزمین ایک عظیم علمی ،تاریخی ،ثقافتی اور فنی وعلمی بنیادیں رکھنے کے ساتھ ساتھ عرفانی روح بھی رکھتی ہے ۔

زرانم ہوتو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی ۔

پیغام آشا ایران اور پاکستان کی ثقافتی ،تاریخی ،علمی اور ادبی روایت کی کی سالہا سال سے نقیب رہا ہے جس میں آپ اہل قلم اساتذہ اور دانشوروں کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل ہے ۔مجھے امید ہے کہ مجلتوں کا یہ سلسلہ اسی طرح برقرار رہے گا۔

پاک ایران دوستی پائندہ باد

احسان خزاعی

پاکستان میں عصر حاضر کی، چند فارسی گو شاعرات

* ڈاکٹر مسرت واجد

A few contemporary Persian poets associated with teaching and other fields(An introduction)

Dr. Musarrat Wajid

In our country, where Persian language and literature has obviously decreased. That is, Persian language and literature has been limited to some institutions and people. But even today some people are creating Persian literature. Both men and women are included in this effort. In this research article, mention is being made of women who have been performing their services in educational and non-academic institutions or who are still performing teaching and other duties, and they are with Urdu poetry and speech. Along with Persian poetry, they are benefiting the people. In this article, along with brief information about their living conditions, a sample of their speech is given

ایران کی طرح، برصغیر میں بھی تذکرے لکھے جانے کی روایت بہت پرانی ہے اور اس حوالے سے اردو اور فارسی زبان میں، تذکروں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ مثلاً تذکرہ گلستان سخن (بہ زبان اردو)، دو جلدی (طبع اوّل: جون ۱۹۶۶ء) مصنفہ، مرزا قادر بخش صابر دہلوی (۱۲۲۳ھ۔ق/ ۱۸۰۲ء۔ ۱۲۹۹ھ۔ق/ ۱۸۷۸ء) مرتبہ، خلیل الرّحمان داؤدی (۲ مارچ، ۱۹۲۳ء۔ ۲۶ جنوری ۲۰۰۲ء)، تذکرۂ مخزن نکات (بہ زبان فارسی) (طبع اوّل: نومبر ۱۹۶۶ء) مصنفہ، قیام الدّین چاند پوری (۱۱۳۵ھ۔ق/ ۱۷۲۲ء۔ ۱۲۰۸ھ۔ق/ ۹۳۔ ۱۷۹۴ء) مرتبہ، پروفیسر ڈاکٹر اقتدا حسن، تذکرۂ شعرای پنجاب (بہ زبان فارسی) (طبع اوّل ۱۹۶۷ء) مرتبہ، سرہنگ خواجہ عبدالرّشید۔ اور ان میں سے

* پروفیسر، شعبہ فارسی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

زیادہ تر، اردو شعراء حضرات کے متعلق معلومات باہم پہنچاتے ہیں۔ یعنی بعض اوقات زبان تو فارسی ہے لیکن تذکرہ اردو شعرا، کا ہے۔ اور ان میں خال خال ہی فارسی شاعروں کا ذکر ملتا ہے اور فارسی شاعرات تو بہت ہی کم۔ لیکن حکیم فصیح الدین رنج (۱۸۳۶ء۔ ۱۸۸۵ء) کا لکھا ہوا ''بہارستان ناز'' اردو زبان میں، پہلا تذکرہ ہے جو، پہلی مرتبہ، ۱۸۶۴ء، مطبع دارالعلوم میرٹھ سے، بار دوّم، بھی اسی ادارے سے ۱۸۶۹ء، بار سوّم مطبع عثمانی میرٹھ، سے ۱۸۸۲ء میں چھپا۔ جو خالصتاً شاعرات کے متعلق ہے اس میں تقریباً ۱۷۴ شاعرات کا ذکر ملتا ہے ان میں سے تقریباً ۴۷ شاعرات ایسی ہیں جو کہ کسی بھی خطے سے تعلق رکھتی ہوں؛ نے یا تو خالصتاً فارسی میں سخن سرائی کی یا پھر اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر کہا۔ یہ تذکرہ ۱۹۶۵ء میں مجلس ترقی ادب، لاہور نے، خلیل الرحمان داؤدی (۱۹۲۳ء۔ ۲۰۰۲ء) کے مقدمہ کے ساتھ چھاپا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی تذکرے لکھے جانے کا رواج رہا ہے۔ لیکن خواتین شاعرات کے حوالے سے بہت کم تذکرے ملتے ہیں۔ اگر تذکرے ملتے بھی ہیں تو، اردو شاعرات اور نثر نگار خواتین کا پتہ دیتے ہیں لیکن فارسی گو شاعرات کے تذکرے بالکل نہیں ملتے۔ اس خیال کے پیش نظر یہ تحقیقی مضمون لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں ایسی چند شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ درس و تدریس اور دیگر شعبوں سے وابستہ ہیں یا رہی ہیں۔ اور ان میں سے زیادہ تر آج بھی اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر کہہ رہی ہیں کی ہیں۔ ان خواتین کا تذکرہ الفبائی طور پر کرنے سے پہلے چند ایسی خواتین کا ذکر کیا جاتا ہے جو گھریلو خواتین ہیں یا جن کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ ان میں پہلا

پروین دخت اختر شیرانی کا نام ملتا ہے (ان کے متعلق معلومات نہیں ملیں)، پروین دخت کا فارسی کلام ''نعت رسالت مآب''، نمونے کے طور پر دیکھئے:

نعت حضور خواجه بطحا نوشته ایم	صدها صفات حسن را ،یکجا نوشته ایم
این نظم گوهرین ،به هزار عز و احترام	در مدح تاجدار مدینا نوشته ایم
صلّ علیٰ بر مرسل رحمت نشان بباد	شان جمال صاحب اسریٰ نوشته ایم
بر دل،برای بخشش عصیان،بروز حشر	نام حبیب پاک را صد جا نوشته ایم
بودیم دل شکسته و وامانده و حزین	رو داد غم به نور سراپا نوشته ایم
ای کار ساز عالمیان! کار من بساز!	فریاد دل به خدمت آقا نوشته ایم
این نامه در شکایت آلام روزگار	سوی مکین گنبد خضریٰ نوشته ایم

آنجا که بارد رحمت خلّاق کائنات　　هر غم ببارگاه معلیٰ نوشته ایم
شاه امم! بحال من زار کن نظر　　بر جان ما چه حشر شد برپا،نوشته ایم

(فصلنامہ دانش،۱۹۹۸ء،۱۹۹۹ء،شمارہ : پاییز،زمستان ۵۴۔۵۵،ص۱۸۸:)

اس کے علاوہ، پروین دخت کی ایک فارسی غزل ملاحظہ فرمائیے!

یارب ! چه شد ؟که فصل بهاران نمی رسد　　باد صبا به صحن گلستان نمی رسد
از دام و دد توان شدن انسان ،بفیض عشق　　آدم بغیر عشق به یزدان نمی رسد
باز آمده سکندر رومی چو نامراد　　باردگر به چشم حیوان نمی رسد
یادش بخیر! پهلوی محبوب خوش جمال　　دستم کنون به تار گریبان نمی رسد
هرجا گیاه خشک و زمین تشنه گشته است　　عمری گذشت،موسم باران نمی رسد
آن دور مختصر که بزودی تمام شد　　اکنون به زیر گنبد گردان نمی رسد
باغ خوش است روضه رضوان،ولی ندیم　　این گل زمین به کوچۀ جانان نمی رسد

(فصلنامہ دانش،۱۹۹۸ء،شمارہ: زمستان ۵۱،ص ۱۹۲:)

ذکیہ بہروز ذکی: (پیدائش ۲۶: جون ۱۹۶۲ء) آپ کوئٹہ میں پیدا ہوئیں۔آپ کے والد حاجی فقیر حسین کوئٹہ میں چمڑے کے کاروبار سے وابستہ تھے۔ذکیہ نے گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے بی۔اے کیا۔آپ ایک گھریلو خاتون ہیں جو گھر پر ڈیکوریشن پیس بناتی ہیں۔آپ کی مادری زبان فارسی ہے۔آپ نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کئے اردو ،فارسی اور ہزاروی زبان میں شعر کہتی ہیں۔آپ کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں، جن کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ اردو مجموعہ کلام ''دریچۂ گل'' ۲۰۰۵ء میں چھپا۔
۲۔ فارسی مجموعہ کلام ''هنوز در سفری'' ۲۰۰۸ء میں فکشن ہاؤس لاہور، سے چھپا۔
۳۔ اردو مجموعہ کلام ''موسمِ گل گزر نہ جائے کہیں'' ۲۰۱۵ء میں، بزمِ خسرو کوئٹہ، سے چھپا۔
۴۔ اردو مجموعہ کلام ''حرفِ گل کی نامہ بر'' ۲۰۲۱ء میں، سانجھ پبلی کیشنز لاہور سے چھپا۔
۵۔ اردو مجموعہ کلام ''مسافر راہِ عشق'' ۲۰۲۲ء میں، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور سے چھپا۔

ذکیہ بہروز ذکی، آزاد دائرۃ المعارف

انٹرویو از ذکیہ بہروز ذکی، باواٹس ایپ

ذکیہ کی فارسی شاعری کا نمونہ بہ عنوان ''چرا؟؟'' ملاحظہ فرمائیے!

ای دلِ نادان و غافل اینقدر مستی چرا؟ چشمِ بینا باز کن! چشمانِ دل بستی چرا؟

در فلک پرواز کن !مثلِ همای دلنواز همنشینِ ذاغ گشتی،رفتی در پستی چرا؟

فکر کن! چون آمدی، کارت چنان بود در جهان بعد ازین عزم کجا و در جهان هستی چرا؟

چون فرا آمد اجل وجدان در گوشم بگفت یک سرائی بود دنیا، دل بدو بستی چرا؟

ای ذکیؔ! این لعل قلبت را بدنیا باختی گوهرِ نایاب را،درخاک وارستی چرا؟

ذکی، بہروز، ذکیہ، ھنوز درسفری، ۲۰۰۸ء، صص ۱۰۲: ۔ ۱۰۳

طاہرہ مجید/نگار: ان کے متعلق معلومات نہیں ملتیں لیکن ان کی ایک غزل ملتی ہے ۔کیونکہ یہ پاکستانی ہیں اور فارسی میں غزل کہی ہے،اس لئے شامل مضمون کیا جارہا ہے۔

بیا !که بی قرارشد دلم به حال هجر بیا !که از توان فزوده شد ملال هجر

بهار شد فدای بیم آمد خزان وصال نیزرفت فدای احتمال هجر

برو و از دل غمین دعای بد مگیر مخندان فلان منم شکسته حال هجر

مرا ز سرنوشت عشق آگهی نبود امید بار وصل کردم از نهال هجر

منم که در ازل ز یار خود جدا شدم ''نگار'' چون کنم شمار ماه و سال هجر

(فصلنامہ دانش، ۱۹۹۸ء، شمارہ : بہار ۵۲، ص ۱۶۴:)

اب ذیل میں ان خواتین کا ذکر کیا جاتا ہے جو تعلیمی اداروں میں درس وتدریس کے فرائض سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ، فارسی زبان میں شعر بھی کہہ رہی ہیں ۔ان کے شعری نمونوں کا، اہم حوالہ فصلنامہ دانش ، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان، اسلام آباد ہے جس میں وقتاً فوقتاً ان خواتین کا کلام چھپتا رہا ہے ۔(ان شاعرات، کا تذکرۃ، الفبائی ترتیب سے، ان کے مختصر حالات اور فارسی شاعری کا نمونہ) ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

ا۔امبر یاسمین: ڈاکٹر امبر یاسمین، ۲۲، اپریل، ۱۹۷۳ء، بہ مقام راولپنڈی، پیدا ہوئیں ۔آپ کے والد کا نام محمد اختر

تھا۔آپ نے ابتدا سے بی۔اے تک کی تعلیم راولپنڈی شہر سے ہی مکمل کی۔بعد میں نمل سے ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی ،زبان و ادبیات فارسی میں کیا۔اورآپ نمل یونیورسٹی اسلام آباد میں ۰۱/ ۱۲/ ۲۰۱۱ء۔ ۱۸/ ۰۶/ ۲۰۱۵ء تک کل وقتی ،کے Senior Instructor in persian، طور پر کام کیا۔اس کے بعد ۱۹/ ۰۶/ ۲۰۱۵ء۔ ۲۴/ ۰۶/ ۲۰۱۵ء تک کل وقتی لیکچرر کی حیثیت سے،اور ۲۵/ ۰۶/ ۲۰۱۵ء سے اب تک کل وقتی اسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے،،فرائض انجام دے رہی ہیں۔استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ،محقق اور مترجم بھی ہیں۔ان کے بقول انہیں مترجم کہا جائے تو بہتر ہوگا۔انہوں نے ایک ایرانی شاعرہ سیمین دانشور کی فارسی داستانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔جلد چھپنے والا ہے۔اسی طرح ''کاروان حلّہ'' جس کا پہلا حصہّ ڈاکٹر مہر نور محمد(استاد نمل یونیورسٹی اسلام آباد)اور کلثوم سیّد(مرحومہ بھی نمل یونیورسٹی اسلام آباد میں استاد تھیں)نے ترجمہ کیا تھا اب دوسرے حصے کا ترجمہ امبر یاسمین اور ڈاکٹر مہر نور محمد کر رہے ہیں۔وہ ترجمہ بھی چھپ رہا ہے۔انٹرویو،مارچ ۲۰۲۱ء،بہ ذریعہ ٹیلی فون فارسی میں وہ آزاد نظم کے ساتھ ساتھ پابند نظم بھی کہتی ہیں۔ان کے والد کی وفات پر ایک مطبوعہ نظم نمونہ کے طور پر دیکھئے،بہ عنوان،بہ یاد پدر:

بی تو

ای پدر

گشت اندوهگین زندگی

شده ناپدید منظرها

به هر جا که می نگرم

ترا نمی بینم

به یاد تو می افتم

به تو می رسم

امّا

نمی توانم با تو صحبت کنم

بی تو

ای پدر
ویران گشته است خانه ام
نمی رسد صدایت به گوشم
همه خاموشند فرزندانت
دگر دعایت به جانم نمی رسد
بی تو
ای پدر
به که گویم حال دلم
تو بودی برایم
خضر راه
امّا خوشحالم
که تو پیش خدایم
ترا باد رحمت خدا!

(فصلنامه دانش، ۲۰۰۸ء، شماره : پاییز ۹۴، ص ۲۳۸:)

فریب زندگی: (یہ اس سے پہلے نہیں چھپی)

رنگینی ی لهجه های مردم را ،ببینید! لجبازی رفتارشان را ،ببینید!
گویند که همراه سفر هستیم چطور عوض می کنند راهشان را،ببینید!
از چهره های شناسان چگونه خوردیم فریب سادگی ی ما ساده نفسان را،ببینید!
فریب عشق چقدر زیباست ای دوست! زرنگی زیبا رویان را ،ببینید!
تقدیر سپرد ما را ،به دست بی قدران چگونه بازی کردند،با حال ما را ،ببینید!
جفای دوستان را گرفتیم وفای دوست بی خبری ما بی خبران را ،ببینید!
از فریب دنیا هستیم اشک ریزان خندۀ تقدیر و آشنایان را،ببینید!

بہ ذریعہ ایمیل

شہر خاطرات: (یہ کلام بھی پہلے کہیں نہیں چھپا)

عجیب شہری است

پُر از شادی وغم

گاہی طائر خیالم می رسد

بہ کوچہ ای پُر از شادی

کز زمزمہ ھای خوبان، بہ گوشم می رسند

گاہی اندیشہ ام بہ پرواز می کند

می رسد بہ عمق دریا

بہ لحظہ ھای فراموش نشدنی

فرومی رود بہ لحظاتی کہ بادوستان بودم

وقتی بہ ساحل می رسد، این طائر افسردہ

با چشم نمناک

نگاہی بہ گذشتہ می زند

با صدای لرزان می سراید

خستہ ام از زندگی

چہ حاصلی از ین مسیر؟

بہ ذریعہ ایمیل

۲۔رشیدہ حسن خان: ڈاکٹر رشیدہ حسن، ۱۲ فروری ۱۹۵۴ء کو، ایبٹ آباد میں پیدا ہوئیں۔آپ نمل یونیورسٹی اسلام آباد میں فارسی کی استاد کی حیثیت سے ۱۱ فروری ۲۰۱۴ء کو ریٹائر ہوئیں۔انہوں نے تہران یونیورسٹی سے فارسی میں پی ۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ان کا فارسی کلام مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر، چھپتا رہتا ہے۔کبھی موقع کی مناسبت سے بھی شعر کہتی ہیں مثلاً کوئی محفل ہو، کوئی خاص موقع ہو تو وہ اپنی محبت کا اظہار منظوم انداز میں کرتی ہیں۔ان

کے اشعار میں جذبوں کی سچائی اور سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے۔ان کی زندگی، میں نومبر ۲۰۱۸ء میں، ایک جان کاہ واقعہ رو پذیر ہوا، کہ ان کے بیٹے؛ کرنل شبیہ الحسن خان، وفات پا گئے ہیں۔جس سے ماں کی ممتا کا چین و قرار چھن گیا۔اللہ تعالی ان کے بیٹے کے درجات بلند فرمائے اور ڈاکٹر رشیدہ حسن کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین! آپ کا فارسی کلام، فصل نامہ دانش، مرکز تحقیقات، ایران و پاکستان، اسلام آباد، میں چھپتا رہا ہے۔نمونہ کلام بہ عنوان: در کتاب عمر:

گوهر دل می سرایم پایداری کن مرا — در زمین عاشقی هم شهسواری کن مرا
آشنایم جز غم دل نیست در دنیا کسی — من که عمری غصه خوردم، غمگساری کن مرا
بر دل آشفتهٔ غمدیدهٔ من رحم کن! — ناامیدی ها زدوده، یادگاری کن مرا
آخر از خلوت نشینی ها رهایم کن دمی — خسته و از پا فتادم، یار، یاری کن مرا
من که در بزم خسان چون شمع گریان بوده ام — نور بخش خلوت و شب های تاری کن مرا
تندباد برگ ریزان برگ برگ من فسرد — ای بهار من بیا! و نوبهاری کن مرا
خاطرات دلنشین دارم ،دمی بنشین برم — پس رها از گریه و اندوهباری کن مرا
نو گلی شاداب بودم، غم خزانم ساخته است — شاخهٔ افسرده ام ،تو آبیاری کن مرا
این "رشیده" آمده در شاهراه عاشقی — سالک راه تو هستم، راهواری کن مرا

(فصلنامه دانش، ۲۰۰۵ء، شماره: پاییز ۸۲، ص ۲۱۲:)

مثال دیگری، به عنوان: تصمیم:

از سر سوز دل، آهسته دعا خواهم کرد — دست کوتاهم و تغییر قضا خواهم کرد
تکیه بر عهد تو و باد صبا خواهم کرد — من دگر مرتبه تکرار خطا خواهم کرد
گرچه نیرنگی تو ،کار ز بنِ یادم برد — حل این نکته، به تدبیر دعا خواهم کرد
من که خاموشی من ،طرفهس زبانی دارد — بالب دوخته، طوفان بپا خواهم کرد
بعد ازین ، رابطه با سنگ صبوری دارم — قلب غمدیدهٔ خود، از تو جدا خواهم کرد
صلح و آرامش من، تهمتی گردیده است — من کنون عربده با خلق خدا خواهم کرد
می رسد روزی که رسوای زمانش سازم — نسبت دوست به هر بی سرو پا خواهم کرد

(فصلنامہ دانش،۲۰۰۷ء،شمارہ: بہار ۸۸،ص ۲۵۰:)

مثال دیگر از رشیدہ حسن، بہ عنوان: درامید صبح روشن

نو گلی شاداب بودم درمیان بوستان
همچو خاری می خلم در دیده های دشمنان

مرگ را چون سایه هر دم برسرم بینم کنون
من حیات انگیز بودم درمیان دوستان

قایقی بشکسته ام در موج دریا غوطه زن
کرد طوفان حوادث آنچنانم سرگران

زیر بار زندگی ناامید و خسته دل
شاخهٔ بشکسته ای در موج طوفان خزان

زیر بار زندگانی نا امید و خسته دل
مانده ام من چون غریبی در قفای کاروان

در امید صبح روشن شام تار زندگی
بگذرانم تا به کی در کلبهٔ بی سائبان؟

(فصلنامہ دانش،۲۰۰۸ء،شمارہ :پاییز ۹۴،ص ۲۳۶:)

۳۔رضیہ اکبر: ڈاکٹر رضیہ اکبر (پیدائش ۱۹۵۴ء) پشاور میں پیدا ہوئیں۔آپ کے والد ایک آرمی آفسر تھے۔اس لئے آپ کی ابتدائی تعلیم آرمی پبلک سکول سے مکمل ہوئی۔آپ کے والد نے،حکومت پاکستان کی طرف سے،ایران میں بھی خدمات سرانجام دیں۔اس دوران نے،میٹرک تک ایران ہی میں تعلیم حاصل کی اور بعد میں اسلام آباد کالج سے، ایف۔اے،بی۔اے، کیا۔پھر ایم۔اے فارسی نمل یونیورسٹی NUML (نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز) ؛جو اس وقت نمل NIML یعنی نیشنل انسٹیٹوٹ آف ماڈرن لینیگوئجز تھا،سے مکمل کیا اور اسی یونیورسٹی ہی میں،درس و تدریس کا شغل اختیار کرتے ہوئے،تاریٹائرمنٹ،اسی ادارے سے وابستہ رہیں۔آپ فارسی بہت خوب صورت لب و لہجے میں بولتی ہیں۔آپ کی شادی آپ کے چچازاد سے ہوئی،جوکہ پیشے کے لحاظ سے آرمی سے وابستہ تھے۔آپ کے سسر بھی آرمی آفیسر تھے۔آپ کے دو بیٹے ہیں۔آپ کے شوہر ۱۹۹۷ء میں شہید ہوگئے۔شوہر کی شہادت ہی،ان کی شاعری کا محرک ٹھہری۔اور انہوں نے اسے اپنے شوہر سے محبت اور ان کے جانے کے بعد مسائل کو سہنے کا سہارا بنایا۔آپ کا فارسی کلام فصل نامہ دانش،مرکز تحقیقات ایران و پاکستان،اسلام میں چھپتا رہا ہے۔آپ کا شعری مجموعہ؛''سبوی شکستہ''،ایران سے چھپا ہے۔آپ نمل یونیورسٹی اسلام آباد میں،شعبہ فارسی میں بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر،فرائض سر انجام دیتی رہی ہیں اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی شعبہ میں تحقیقی اور تدریسی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ضمناً بتاتی چلوں کہ ڈاکٹر رضیہ اکبر صاحبہ کے آباء پشاور سے ملتان کی طرف ہجرت کر کے آئے۔ان کے دھدیال

اور موروثی زمینیں بھی ملتان میں موجود ہیں۔

انٹرویو، از ڈاکٹر رضیہ اکبر، مارچ ۲۰۲۱ء، بہ ذریعہ ٹیلی فون، واٹس ایپ

(آپ کے متعلق، زنان شاعر پارسی گو، ہفت شہر عشق از مہدی شاہ حسینی، میں معلومات ملتی ہیں)

نمونہ کلام، بہ عنوان ''ای یار!'' ملاحظہ فرمائیے! جس میں اپنے محبوب شوہر کی جدائی اور ان کی یاد میں، ان سے مخاطب ہو کر فرماتی ہیں کہ :

بی تو چشم بی نورم　　بی تو چشمۂ بی آبم

بی تو آسمان بی ستارہ ام　　بی تو درخت بی سایہ ام

بی تو آفتاب بی نورم　　بی تو مرغ نیم بسملم

بی تو نِی شکستۂ ساربانم　　بی تو کشتی بادبان شکستہ ام

بی تو پرندۂ بی بالم　　ای یار! ای غمگسار!

جدا شدی از من زود

تنہا ماندم مثل پرستویی کہ از کوچ می ماند　　تنہا ماندم مثل ستارہ یی کہ بر فلک می درخشد

تو ستارہ ای،تو گلی، تو بارانی　　تو شبنمی ،تو شگوفہ ای،تو بہارانی

در ہمہ چیزہا،تو را می بویم　　تا شاید،تو را بجویم

ہر گل چمنستان را ،می بویم　　نا شاید،تو را بجویم

ای یار! ای غمگسار!　　جدا شدی از من زود

بی تو ہنوز ہم،آفتاب از مشرق بر می آید　　بی تو ہنوز ہم،صدای زمزمۂ آب سر می آید

بی تو ہمۂ پرندگان چہچہہ می زنند　　بی تو ہمۂ گلہا شگوفہ می کنند

ای یا! ای غمگسار!　　جدا شدی از من زود

مثل گل صد بر گ از ہم پاشیدی　　مثل فرہاد بہ خواب شیرین خوابیدی

ای یار! ای غمگسار!　　جدا شدی از من زود

اجل رسید و بی خبر رفتی از دنیا　　نه ،نه غمخوار،سبک بار رفتی از دنیا
من و سه فرزندت، مانده تنها!　　از تو جدا!

(فصلنامہ دانش،۱۹۹۸ء،شمارہ: پاییز وزمستان ۵۵۔۵۶،ص ص ۱۹۱:۔۱۹۲)

ایک اور نمونہ کلام، بہ عنوان گوہر تنہایی:

غمی پنهان در چشمانم موج می زند　　قطره قطره از کنج چشمانم می ریزد
قادر به حرف زدن نیستم　　بغض دلم نمی گذارد مرا
از زندگی و غوغای آن　　افسرده و بی حس شده ام
از حوادث گیتی رنجورم　　فراز و فرود زندگی را پیموده ام
دل می خروشد و جان می نالد　　تو که با گوهر تنهایی ام آشنایی
تو که ناگفته اسرارم را ،می دانی　　حاجت به بیان فسانهٔ زندگیم نیست
"راضیه" دل سرشار، به دریا زده ای　　کتاب زندگیت را ،دوباره باز کرده ای

(فصلنامہ دانش،۲۰۰۵ء،شمارہ: پاییز ۸۲،ص ص ۲۱۲:۔۲۱۳)

۴۔زبیدہ صدیقی: (پیدائش ۲۴ فروری /۷ ۱۹۳ء۔وفات ۱۹۹۳ء)، دوراہا منڈی ، ریاست پٹیالہ میں پیدا ہوئیں۔اپنے والد محمد صدیق کی نسبت صدیقی کہلائیں۔زبیدہ کا تعلق راجپوت چوہان خاندان سے تھا ان کے ایک بزرگ نے اسلام قبول کیا اور مبلغ اسلام ہونے کا شرف پایا۔زبیدہ کے والد مولوی محمد صدیق نے اپنے پرکھوں کی روحانی اور دینی میراث کے سچے نگہدار ثابت ہوئے۔حب رسول ﷺ سے ان کا دل معمور تھا وہ شاعری کی زبان میں خواجہٴ دوسرا کی مدح سرائی کیا کرتے تھے۔ان کے اشعار،سننے اور پڑھنے والوں میں انقلابی روح پھونک دیتے تھے ۔وہ کلام خدا کو نہایت خوش الحانی سے تلاوت کیا کرتے تھے اور خطیبانہ بیان و لہجہ میں منفرد مقام رکھتے تھے۔دوراہا منڈی میں سرہنگ بیگ نامی، محکمہ نہر کے بنگلہ میں منشی ملازم تھے قیام پاکستان سے ۶ یا ۱۰ ماہ قبل یہ خاندان لدھیانہ اور پھر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مہاجرت کرکے ضلع ملتان کے ایک شہر،وہاڑی میں آباد ہوگیا۔

زبیدہ صدیقی ۱۹۶۳ء میں سایہٴ پدری سے محروم ہوگئیں۔ جب کہ عین دو سال بعد ان کی والدہ محترمہ زینب خاتون جون ۱۹۶۵ء میں انتقال کرگئیں۔ ان دونوں جانکاہ واقعات نے ان کے قلب و ذہن پر، انمٹ نقوش

مرتسم کئے۔والدین کی فرقت کا یہ دکھ زندگی بھران کے ساتھ رہ کر،انہیں تنہائی کا شکار بنا گیا۔

زبیدہ کی آنکھ مذہبی ماحول میں کھلی والدہ کی اتالیقی میں قرآن پاک ناظرہ ختم کیا۔ ۱۹۵۵ء میں ایم۔بی گرلز ہائی سکول وہاڑی سے میٹرک اوّل درجہ میں پاس کیا۔پھر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ۱۹۵۷ء میں ملتان سے ایف اے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۵۹ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج ملتان سے بی اے کیا۔ جبکہ ۱۹۶۱ء میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے ادبیات فارسی میں ایم۔اے کیا بعد ازاں ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم۔اے کرلیا۔ابتدائے عمر سے ہی ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں۔اسی ذوق کو نمو دینے میں آپ کے اساتذہ کرام؛ ڈاکٹر عبدالشکور احسن،ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر سید عبداللہ،ڈاکٹر فیروزالدین رازی ڈاکٹر محمد علی اور ڈاکٹر محمد باقر کا بہت کردار رہا۔ر۔ک :(واجد،مسرت،الزبیر،۲۰۰۸،بہاول پور،ص ۵۹:۔۸۲)اس طرح انہوں نے فارسی زبان وادب پر کما حقہ،دسترس پائی۔ایران میں پی ایچ ڈی کے دوران ان کے ہم جماعت،ڈاکٹر اکرم شاہ اکرام،ڈاکٹر آفتاب اصغر،ڈاکٹر مجید قریشی اور ڈاکٹر ممتاز غفور تھے۔

۱۹۶۲ء کو زبیدہ سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئی تھیں،پہلے سانگھڑ کالج (حیدر آباد) پھر گوجرہ کالج میں بطور پرنسپل رہیں۔۱۹۶۶ء میں ایران چلی گئیں وہاں سے ایم لٹ اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پاکستان کو مراجعت کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین ملتان میں اُردو کی لیکچرار مقرر ہوئیں ۔ ۱۹۷۶ء سے کئی سال تک وہ خانہ فرہنگ ایران ملتان میں ابتدائی فارسی اور ایم اے فارسی کی کلاسوں کو پڑھاتی رہیں ۔ ۱۹۸۵ء میں کالج آف ایجوکیشن ملتان میں متعین ہوئیں ۔ پھر ۱۹۹۰ء میں گرلز کالج وہاڑی چلی آئیں۔اس کے بعد وہ اڈھا ک پر کالج آف ایجوکیشن ملتان میں پڑھانے لگیں جبکہ تنخواہ گرلز کالج وہاڑی سے وصول کرتی تھیں۔آپ کا فارسی دیوان ’’یتفجر منہ الانھار‘‘ آپ کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا۔

ر۔ک: احمد،ظہورالدین،۲۰۰۵ء،اسلام آباد،ص ۱۰۸:۔۱۰۹) زبیدہ صدیقی کے اشعار سے نمونہ ملاحظہ فرمائیں!

ای قبله ی جان حاصلِ بتخانه تویی تو	در دیرِ مغان نعره ی مستانه تویی تو
هم محتسب و قاضی و سجّاده و دلقی	هم رندی و هم شیشه و پیمانه تویی تو
مستیم و ز جبریل امین سجده ربودیم	ساقی ی ازل رونقِ میخانه تویی تو
در عشقِ تو از دردِ رقابت خبری نیست	هر دلشده را دلبرِ جانانه تویی تو

پنهانی و صد غمزه ی غمّازِ تو پیدااست
رازی و برِ خلق هم افسانه تویی تو

شاها پی تاراجِ دلم چند بتازی
دانی که به این کشورِ ویرانه تویی تو

نالید زبیده که کجا هوش و حواسم
خندیده دو چشمش که چه دیوانه تویی تو

زبیدہ صدیقی، یتفجر منہ الانھار، ۱۹۷۶ء، ص ۱۴: ۔۱۵

۵۔سمن عزیز: اسلام آباد کی رہنے والی ہیں۔ان کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔اگروہ خود یا ان کا جاننے والا یہ آرٹیکل پڑھیں تو برائے مہربانی،اپنے متعلق معلومات مہیا فرمائیں۔تاکہ آئندہ،بہ وقت ضرورت کام آئیں۔

نمونہ کلام بہ عنوان: خوش فہمی

نیامد یار من امروز و فکرش جلوۂ جانان
صدای او رسد،بر گوش و باشد روح را،سامان

نیامد او چرا پیشم،بود بند دل ریشم
ولیکن با همه زحمت، به دیدارم شده خواهان

در آنجا بودم،آن دم من، چرا او را ندیدم من؟
همی اندیشه دارم من، خدا همراه او هر آن

همه دم منتظر باشد، همه ساعت برای من
هر آن چهره که او بیند، خیال من در او پیچان

نباشد صبر او اکنون، ز دوستان حال من پرسد
خدایا بر دلم رحمی، چرا ناید گل دامان

چو دیگر روز رفتم من، همی دیدم و را بی تاب
شدم جویا ز استادم، چه گفت دیروز آن خوبان

ز لبخندش به دست آمد که طنز او بود انکار
همی اندیشه کردم من، که خوش فهمی شده یک آن

"سمن" پیوسته می گوید: من آن خوشبو گلم هرجا
دل آیینه دارم من، همیشه در ره جانان

(فصلنامہ دانش، ۲۰۰۷، شمارہ: تابستان ۸۹، ص ۲۳۰:)

نمونہ کلام بہ عنوان: خوشی و غم

نسیم خوش چو وزد در خیال من آید
ز چهره اش و چو بهاری مثال من آید

ز جان او بر من هم خوشی و غم آورد
همو کسی است که او عرش در کمال من آید

آیا بود به وجودم گل محبت احساس
فسوس ازاین بود که دل او مجال من آید

ازو رسیده محبت ولی منم مجبور
غمش جدا شده از سایۂ چون نمال من آید

چو دیدنش ز من آسان بود منم از او
ز درویش غم او در وبال من آید

منم همیشه خوش و لیک دردها به پا خیزد　　کسی بود همه دم در وصال من آید
سمن به یاد تو هر لحظه جسم و جان سوزد　　تو رهبری و خوشی پرو بال من آید

(فصلنامہ دانش،۲۰۰۸ء،شمارہ: زمستان۹۱،ص۲۳۶:۔۲۳۷)

۶۔عطیہ خلیل عرب: (پیدائش ۱۹۳۷ء۔وفات ۲۰۱۶ء) بھی کراچی یونیورسٹی میں عربی کی استاد اور صدر شعبہ رہی ہیں۔ر۔ک:https://www.bhatkallys.com>articles اور عربی کے ساتھ فارسی میں بھی شعر کہتی تھیں ر۔ک: (صدیقی،احمد حسین،دبستانوں کا دبستان کراچی،جلد دوم،صص ۳۳۳:۔۳۳۵)اوران کا کلام،فصل نامہ دانش،مرکز تحقیقات،ایران و پاکستان،اسلام آباد،میں چھپتا رہا۔ان کے فارسی کلام کا نمونہ ،بہ عنوان: من وتو،درج ذیل ہے :

ای! که از سوز فراق تو پریشان سوختم　　پا به جولان سوختم رقصان و گریان سوختم
او بت کافر نداند رسم دلداری و من　　ریختم طرح حرم در کافرستان سوختم
تو که اندر قریهٔ جان ناز فرمائی و من　　آتشی در سینه دارم در بیابان سوختم
من ز بلبل نغمه و آه و فغان آموختم　　در چمن زار و بهار کوی جانان سوختم
شعلهٔ جان می فرستم هرکجا تو می روی　　من نمی دانم چرا در ابروباران سوختم
از فغان بر دل قیامت رفت و کس آگاه نیست　　فاش می گویم که من محشر بدامان سوختم
ای که وصلت نیست ممکن در جهان بی امان　　وی که اندر التهاب نار هجران سوختم

(فصلنامہ دانش،۱۹۹۸ء،۱۹۹۹ء،شمارہ :پاییز،زمستان ۵۴۔۵۵،ص۱۸۷:)

۷۔عظمی زرّین نازیہ: عظمی زرین نازیہ،شعبہ فارسی،اورینٹل کالج،پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔اس سے قبل،آپ لاہور کالج یونیورسٹی برائے خواتین سمیت کئی اداروں میں فرائض تدریس سرانجام دیتی رہی ہیں۔آپ فارسی اور اردو میں شعر کہتی ہیں۔آپ زیادہ تر صوفیانہ و عارفانہ شاعری کرتی ہیں ؛جن کے موضوعات : حمد،نعت،منقبت وغیرہ ہوتے ہیں۔ان کا کلام فارسی مجلہ فصلنامہ دانش میں چھپتے رہے ہیں۔حال ہی میں آپ کے کلام ،نوای زرّین،کے نام سے ایران سے چھپا ہے۔آپ کا کلام دنمونہ شعر بہ عنوان: اسرار محبت

آنکه عشق لم یزل دارد تو بیگانه است ای زمانه دوستت اینجا فقط دیوانه است
من نمی گویم که من فرزانه و جانانه ام من که بیمار محبت زندگی پیمانه است
من مسافر موج ر خشم راه می کوبم فقط بر لب ساحل سرودم عاشقی دردانه است
موج سیلی زد و گفتا عشقی بیچارگی است چونکه اسرار محبت در دل پروانه است
شعر حافظ،مولوی،سعدی و جامی خوانده ام هر یکی گوید محبت ساقی و پیمانه است
عارفان عصر حاضر از محبت بی خبر چون نمی گویند جلوه جلوهٔ جانانه است
زینهارار ای رهرو راه محبت زینهار زرد رویی می فزاید این در میخانه است
من ترا گفتم به جای دیگری "زرین" تو مرا گفتی که اینجا خانمان و خانه است

(فصلنامہ دانش،شمارہ: زمستان ۹۱،ص ۲۳۵:)

نمونہ کلام بہ عنوان: بر در گذشت دوستم:

با چشم اشکبار ترا یاد می کنم چون لالهٔ بهار ترا یاد می کنم
ریزند برگ های درختان به یاد تو در فصل برگ و بار ترا یاد می کنم
مارا گذاشتی و به راهِ عدم شدی با آه دل فگارترا یاد می کنم
یادم نمی کنی و ز یادم نمی روی ای یاد ماند گار ترا یاد می کنم
درد فراق تو نگذارد روم به خواب کردم چو بی قرار ترا یاد می کنم
یکدم رخت نما که ترا دوست داشتم ای خفتهٔ مزار ترا یاد می کنم

(فصلنامہ دانش،شمارہ: زمستان ۹۵،ص ۲۳۷:)

۸۔فائزہ زہرا مرزا: (پیدائش ۲۹ : مئی ۱۹۷۱ء) فائزہ زہرا مرزا،حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔آپ کی ابتدا سے بی۔اے تک کی تعلیم حیدرآباد،ہی سے ہے۔آپ نے ۱۹۹۵ء میں،ایم۔اے فارسی کراچی یونیورسٹی سے اور ۲۰۰۷ء میں،پی۔ایچ۔ڈی فارسی،کی ڈگری،تہران یونیورسٹی،ایران سے حاصل کی۔آپ درس وتدریس سے وابستہ ہوئیں اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن،سے لیکچرر فارسی منتخب ہو کر،ایف۔جی مارگلہ برائے خواتین، F-7/4 اسلام آباد میں،۴ ستمبر ۱۹۹۹ء۔۳۱ دسمبر ۲۰۰۶ء تک فرائض انجام دیتی رہیں۔بعد میں ۴ جنوری ۲۰۰۷ء میں،کراچی یونیورسٹی میں آگئیں

اوراب تک یعنی مارچ ۲۰۲۱ء تک، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی کی حیثیت میں اپنے فرائض منصبی ادا کر رہی ہیں۔ آپ کے فارسی اور اردو، تحقیقی مضامین پاکستان کے کئی معروف مجلوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ آپ کئی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں، مقالہ جات پڑھتی رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، کچھ خطی نسخوں کی تصحیح متن کا کام بھی کیا، مثلاً

- تصحیح متن، گرجی نامہ، از شمس العلماء، مرزا قلیچ بیگ، مرکز تحقیقات ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء
- تصحیح متن، محک خسروی، از مرزا خسرو بیگ گرجی، میراث مکتوب، تہران، ۲۰۱۱ء
- تصحیح متن، سرمایۂ بصیرت و میعار الاغلاط، از امیر مینائی، ادبی بورڈ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۲۰۲۱ء

تصحیح متن کے ساتھ ساتھ، بعض کتابوں کے تراجم بھی کئے، مثلاً:

- ارمغانِ عشق، (اقبال کی اردو رباعیات کا فارسی ترجمہ) خانۂ فرہنگ ایران، کراچی، ۲۰۱۳ء
- زبانِ فارسی، فارسی ٹیکسٹ بک ۱، (اردو ترجمہ)، سفارت فرہنگ، اسلامی ایران، سعدی فاؤنڈیشن، ایران، ۲۰۱۴ء
- میراث خیر (اردو ترجمہ، رباعیات، شیخ ابوسعید ابوالخیر، پیکاک پرنٹرز، اینڈ، پبلی کیشنز، کراچی وقادری قلم قبیلہ لاڑکانہ، کراچی، ۲۰۱۵ء

اس کے علاوہ:

- انتخاب اشعار امیر مینائی، (امیر مینائی کی شاعری سے انتخاب، پیش گفتار) نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

اعزازات: پروین اعتصامی ادبی ایوارڈ، سال ۲۰۱۳ء، از وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، ایران۔ (بر تصحیح متن، محک خسروی)

گفتگو، ڈاکٹر فائزہ زہرا مرزا، مارچ ۲۰۲۱

آپ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی ہیں۔ آپ کا فارسی کلام بھی، فصل نامہ دانش، مرکز تحقیقات، ایران و پاکستان، اسلام آباد، میں، تواتر سے چھپتا رہا ہے۔ یہاں پر فارسی نمونہ دیا جاتا ہے۔ نمونۂ کلام، بہ عنوان : آرام جان:

روزی که بود با تو کنارم آرام دل یافت به یک لحظه قرارم آرام
من طالب دیدار تو هر روز و شب بر چهرهٔ پُر نور تو دارم آرام

پیوسته در این کلبهٔ احزان هستم از مرهم تو جان فگارم آرام
بینم اگر آن شمع رخت را یکبار پروانه صفت جان بسپارم آرام
یک بوسهٔ لعلت دهدم نور بصر با بادهٔ جم هیچ ندارم آرام
برحال من ارکنی نگاهی یک دم از صوت تو در باغ و بهارم آرام
ای یار خوش آواز کجایی این دم یابد دل پر زار و نزارم آرام
مهر تو فزوده است روان را شاداب عشق تو نموده است شرارم آرام
هر ناز و ادای تو بود در جانم آورده به صد شور و خمارم آرام
شد نقش تو حک بر دل خوبان هر جا هر نقش تو صد بار شمارم آرام
همواره دعا می کنم و شاد دلم تا بوی خوش آید زنگارم آرام
گر " فائزه" خواهی به وصالش برسی جان بر در حق هست نثارم آرام

(فصلنامه دانش،۲۰۰۷ء،شماره بهار ۸۸: ص ۲۴۸:)

مثال دیگری،از فائزه زهرامرزا،به عنوان: قصهٔ عشق

ای دلبر عزیز ! تو از من خبری کن! من بهر تو دل باخته ام جلوه گری کن!
محروم ز دیدار تو شد چشم تمنّا ای دیدهٔ غم دیده تو درمان تری کن!
در دشت محبت چو زدی پای کوبان همواره چو مستانه دلان سربسری کن!
در شوق وصال مه پُر نور دلاویز همواره به هرگام سفر دل جگری کن!
صد فتنه لیلی و زلیخا تو شنیدی این قصّهٔ عشقم بشنو سینه دری کن!
یارب چه بگویم که نگفتن شد ازآن به پرسان دل ارکس نشده در بدری کن!
گر"فائزه" آن یار بیاید به در تو صد شکر بجا آر! و دعا ی سحری کن!

(فصلنامه دانش،شماره : زمستان۹۱،۲۰۰۸ء،ص ۲۳۶)

نمونهٔ دیگری از فائزه زهرامرزا،به عنوان،مهر دوکشور:

بین ملک پاک و ایران ربط احسن شد یقین بست اردو نقش بر قلب و نظر چون برنگین

مادر اردو شده شیرین زبان فارسی
درخت زیبا می نماید رخ به اهل گل زمین

ارتباط عالی فرهنگ شد محکم اساس
زین سبب مهر دو کشور پایدار است و متین

پاک و ایران وارث میراث فرهنگ و هنر
پاسداران تمدن،حق شناس و اهل دین

اکبری سیستان و قاسم روشن ضمیر
بسته اند با یکدیگر پیمان و عهد راستین

کوشش خانم خلیلی بهر ترویج زبان
باآور شد برای اوستادان مهین

کارمندان همره و کوشا همیشه مستعد
بالب خندان و شادان پر تلاش و نکته بین

بر دو کشور سایهٔ لطف و عنایت یا الٰه
تا قیامت زنده باشند زیر چرخ عنبرین

خدمت علم و ادب باشد شعار "فائزه"
از خدا خواهد بود یارش دعا و آفرین

(فصلنامه دانش،۲۰۰۸،شماره: پاییز ۹۴،ص ۲۳۲:)

فائزه کے کلام میں سے ایک غزل جس میں شاعرہ نے صنعت توسیم(۱) کا استعمال کیا ہے،پیش ہے:

سر زمین عشق را ،شد عهد و پیمان شهریار
عندلیب باغ عرفان گل به دامان شهریار

ناز دارند اهل ایران ،افتخار شاعران
دلبر پیرو جوان شد جان جانان شهریار

او همای عشق حق را از علی آموخته
حیدر بابای وی گشته جهان شهریار

از مئی کوثر شده لبریز جامش بالیقین
تا قیامت ساقی کوثر امان شهریار

پاسدار انقلاب و عصمت ایرانیان
در دیار نیستی شد ماه رخشان شهریار

منزلش افزوده گشت از مدحت آل عبا
جنت عدن نعیم است گلستان شهریار

در محیط آتشین و گرمی آن کارزار
شد نخستین قطرهٔ ابر بهاران شهریار

غوطه زد در قعر دریای ادب با عشق حق
یافته از هر صدف یک دُرّ ایمان شهریار

گوهر یکتا بد و خورشید عالمتاب وی
ترجمان دین حق تفسیر قرآن شهریار

خوش نوا و خوش بیان در هر زمان و هر مکان
در دیار عشق شد مرغ خوش الحان شهریار

گرچه تاج خسروی برسر نداشت آن با کمال
تا ابد گردیده است خسروی دوران شهریار

"فائزه" هم کاروان شد با چنین اهل ادب
نعره ای هم می زند با جمله ایران شهریار

(فصلنامہ دانش، ۲۰۰۷، شمارہ: پاییز ۹۰، ص ۲۴۰:)

۹۔ فتانہ محبوب: نام فتانہ، اور تخلص محبوب کرتی تھیں ۔ آپ کا تعلق کابل، افغانستان سے تھا۔ آپ (پیدائش ۱۹۶۹ ء)، باغ علی مردان کے علاقہ میں، عبدالرحیم و آفاق کے گھر، پیدا ہوئیں۔ آپ نے کابل ہی میں اپنی تمام تعلیم مکمل کرتے ہوئے، کابل یونیورسٹی سے ادبیات و زبان دری میں ایم۔ اے کیا اور افغانستان ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے وابستہ ہوگئیں ۔ بعد میں افغانستان میں جنگ کی وجہ سے حالات خراب ہونے پر، اسلام آباد، پاکستان آ گئیں اور یہاں پر بھی ایک ادارہ ''مکتب لیسہ عالی نجات'' کی بنیاد رکھی اور سن دو ہزار تک بھی، یہ ادارہ قائم و دائم رہا۔ آپ نمل یونیورسٹی اسلام آباد میں لیکچرر فارسی کے طور پر فرائض انجام دیتی رہی ہیں ۔ بعد میں ہالینڈ چلی گئیں ۔ آج کل کینیڈا، یا پھر برطانیہ میں رہائش پذیر ہیں ۔

انٹرویو، از ڈاکٹر رضیہ اکبر، مارچ ۲۰۲۱ء، بہ ذریعہ ٹیلی فون

آپ فارسی میں بہت خوب صورت شاعری کرتی ہیں ۔ آپ کا کلام بھی، فصل نامہ دانش، مرکز تحقیقات، ایران و پاکستان میں چھپتا رہا ہے ۔ آپ کے فارسی کلام کا نمونہ، بہ عنوان: شکست واژۂ دل، ملاحظہ فرمایے!

ز اشک و آه متاثر شود خانۀ دل — زموج حادثه ویران شود لانۀ دل
تو ای که چشم تمنّا به آن قدوم تو بود — فسرد و ریخت تمنا به هر نشانۀ دل
تو آن عظیم و و بلند پایه بر دماغ و دلم — ز حرف بی تحمل ات خموش خانۀ دل
تو آن شکوه بلند عمارتم بودی — ز سرد مهری مهرت خراب ساخۀ دل
نشاط و سرکش و بی باک به سر زمین طلوع — از آن غروب محبت شنو فسانۀ دل
چنان شکست دلم،سرد مهر، بی رحمت — که تا ابد نشود گرم رودخانۀ دل
نبود حرف مروت که بر زبان زدی — ببین! که بسملم اکنون زهر ترانۀ دل
وجود مهر مرا ،شست اشک از قلبت — تو پا گرفتی و رفتی زهر بهانۀ دل
برو که یاد تو هر گز نمی رود از دل — برو که محو نگردی ز هر کرانۀ دل
اگر ز چشم برفتی ز دل نخواهی رفت — توئی گنج خموشانه در خزانۀ دل
غبار عشق تمام وجودمن افسرد — رمید حرف مروت شکست واژۀ دل

(فصلنامہ دانش،۲۰۰۷ء،شمارہ: زمستان ۸۹،ص ۲۲۹:)

قتانہ محبوب، کے فارسی کلام کا، ایک اور نمونہ، بہ عنوان: بھانہ کنم ، درج ذیل ہے:

به طرف کوی تو آیم دعا بهانه کنم — ز حال دل چه بگویم شفا بهانه کنم
ز حرف حرف محبت کلام عشق برم — کتاب عشق نویسم ادا بهانه ساخت
امید دیدن رویت کنم به فصل سکون — سکون نیست خدا را ،چه را بهانه کنم
امید وعدهٔ دیدار جان و قلبم سوخت — برای دیدن رویت چه ها بهانه ساخت
نماز نفل گذارم درود گنج العرش — به کوی دوست روم چون گدا بهانه ساخت
غم فرائض اسلام جان و قلبم سوخت — ز فرض خویش گریزم صدها بهانه ساخت

(فصلنامہ دانش،۲۰۰۸ء،شمارہ: زمستان ۹۱،ص ۲۳۶:)

۱۰۔فلیحہ زہرا کاظمی: ڈاکٹر فلیحہ زہرا کاظمی، لاہور کالج یونیورسٹی، برائے خواتین، شعبہ زبان و ادبیات فارسی میں، بہ حیثیت، پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی، صدر فردوسی کرسی، ڈائریکٹر ایرانیات، خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ بہت اچھی استاد اور منتظم ہیں۔شعبہ میں کئی نیشنل اور انٹرنیشنل کانفرنسیں منعقد کرا، چکی ہیں۔اور کبھی کبھی فارسی شعر کہتی ہیں۔(انٹرویو با واسطہ واٹس ایپ) ر۔ک C.V: ڈاکٹر فلیحہ زہرا کاظمی)

نمونہ کلام از فلیحہ زہرا کاظمی بہ عنوان : تقدیم بہ امام خمینی:

ای که در جانها دمیده ای — ای که بر قلب ها حاکم نشسته ای
جانهای قدسیان همه در حسرت به سوز — تو آذر گشسپ عشق را آتش نموده ای
این سرزمین پاک،که جلوه گاه قدس — تو نور تابناک شب یلدا ای
تا باز،سوز عشق در شمع ما کنی — مدد نما که قطره را، باران کننده ای
یاران ما،سرمست باده ی خراب — جام و سبوی را ره دیوانگی بری؟
آیا شود که نیم نظر سوی ما کنی — زنجیر ماندگی ز تن ما شکنده ای

(فصلنامہ دانش،۲۰۰۷ء،شمارہ: پاییز ۹۰،ص ۲۳۵:)

نمونہ کلام از فلیحہ زہرا کاظمی: بہ عنوان: نیایش بہ بارگاہ امام رضاؑ

ای شاہ خراسان ای نگینۂ الفت ای حاکم شہر قلب محبت
تو ای مالک ایران زمین تو متمکن آسمان عزّت و دین
ای مولای من ،امام رضا آستانۂ تو بوسہ گاہ شاہ و گدا
عاشق جدّ تو صاحب کون و مکان تو نور شاہ لافتی و لا مکان
علم تو ذوالفقار ،راہ تو راہ صراط خواہش ما مختصر دست بگیر بر صراط

(فصلنامہ دانش،۲۰۰۸ء،شمارہ: پاییز ۹۱،ص ۲۳۲:)

۱۱۔کوثر ثمرین: کوثر کا اصل نام کوثر پروین ہے اور قلمی نام کوثر ثمرین ہے۔وہ ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء میں جنوبی پنجاب کے شہر مظفر گڑھ میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ست ایم۔اے اردو کیا۔اور ایران سے فارسی میں ڈپلومہ کیا۔کوثر بہت عرصہ سے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہیں۔انہوں نے ریڈیو پاکستان: ملتان، بہاول پور، پشاور، اسلام آباد، راولپنڈی، پر برڈ کاسٹر، کنٹرولر، پروگرامز کے ساتھ ساتھ پاکستان براڈ کاسٹنگ اکیڈمی، میں بھی فرائض انجام دئے۔اور اب ۶ فروری ۲۰۲۰ء کو ریڈیو پاکستان ملتان کی پہلے خاتون اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔کوثر ثمرین، چار کتابوں کی مصنف ہین۔جن میں سے تین کتابوں پر،انہیں ایوارڈ مل چکا ہے۔وہ دو مرتبہ ریڈیو پاکستان سے پی بی سی ایکسی لینسی ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہیں۔اس کے علاوہ پی ٹی وی اور ریڈیو کے لئے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی انہیں متعدد ایوارڈز سے نوازا گیا۔

ملتان آنے سے پہلے وہ نومبر ۲۰۱۹ء سے سنٹرل پروڈکشن اسلام آباد میں کنٹرولر پروگرامز کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہی تھی۔ر۔ک07/02/2020urdupoint.com: ور۔ک:رضی الدین رضی، www.girdopesh.com 06/02/2020انہوں نے ۲۰۱۶ میں ریڈیو پاکستان کے ایف ایم ۹۴ ورشہ کی انچارج کا منصب سنبھالا۔دیگر منصب پر کام کرنے کے علاوہ ریڈیو اسکردو میں پہلی خاتون اسٹیشن ڈائریکٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دے چکی ہیں۔ر۔ک: صفدر ہمدانی،لندن،aalmiakhbar.com24/11/2016وہ اردو ،سرائیکی کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر کہتی ہیں۔ان کے فارسی کلام سے نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

بہ عنوان :فارسی،زبان محبت،(بہ مناسبت سی امین سال تأسیس مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان)

بنوش از جام ایمان و محبت زبان فارسی شد نور و نعمت
کمال معرفت در بوی گل شد گل عطر سخن ،بوی فصاحت
همه پیوستۂ ذات محمدﷺ بیاید،سوی درگاہ شفاعت
بود ماہ تخیّل در دل تو شدہ روشن جمال مہر و رحمت
نظر کن! آسمان فارسی را نشان اختران پاک تربت
شدہ شیرازی و رومی و اقبال جھا ن عشق و عرفان را شفاعت
گلستان آمدہ چون لالہ زاران بیا گردش کنان در باغ خدمت
زبان لیلی و فرھاد و وامق زبان درد و سوز و آدمیت
زبان رستم و سھراب فردوس بہ یاد داستان ھای شجاعت
جھان گوید ببین نور خدا را بود این ربط پاک و نیک وحدت
خروش مردم عاشق ھمہ جا ببین روشن ھمہ روح حمیت
منم کوثرؔ ھمیشہ تشنۂ تو ثمرؔ از ثمرینؔ دارد صیانت

(ارمغان فارسی، ۲۰۰۲م،ص ۱۳۲:)

۱۲۔نیلما ناہید درانی: (پیدائش ۱۵: اکتوبر ۱۹۵۵ء) نیلما ناہید درانی صحافت کے میدان میں ایک مقام رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ،اردو،انگریزی، پنجابی اور فارسی زبان میں شعر کہتی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اردو افسانے،سفر نامے اور کالم نگاری ان کی پہچان ہے۔ان کا تعلق لاہور سے ہے۔لاہور کالج سے بی۔اے کیا۔پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے فارسی ،ایم۔اے صحافت اور ایم۔اے پنجابی کی ڈگریاں حاصل کیں۔محکمہ پولیس میں ایس ایس پی کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوئیں۔فرائض کی بہ احسن طریق انجام دہی پر کئی ایوارڈ بھی ان کے نام ہوئے۔(ر۔ک: نیلما درانی ،اردو پوائنٹurdupoint.com)

آپ اٹھارہ ۱۸ کتابوں کی مصنف ہیں۔آپ کا اردو شاعری کا پہلا مجموعہ ۱۹۸۶ء میں چھپا۔ان کا فارسی کلام اب تک نہیں چھپا۔(انٹرویو نیلما ناہید درانی بذریعہ واٹس ایپ،مؤرخہ ۲۷ نومبر ۲۰۲۱ء)ان کے غیر مطبوعہ فارسی کلام سے نمونہ ملاحظہ فرمائیے!

شاعر شیرین زبان اقبال بود — ماهر ِنطق و بیان اقبال بود
دانش آموزد ز رومی و عطار — پیروکارِ خواجگان اقبال بود
همنشینِ ساقیان باشد ولی — حافظ قرآن و دین اقبال بود
تیره شب بود نصیب مومنان — آن زمان روشن جهان اقبال بود
خواب او آزاد کرد این خاک را — این دیار ما از آن اقبال بود

بذریعہ واٹس ایپ، مؤرخہ ۲۷ نومبر ۲۰۲۱ء)

مآخذ و منابع:

کتابیں:

۱۔ احمد، ظہورالدین، پاکستان میں فارسی ادب، ۲۰۰۵ء، جلد پنجم، اسلام آباد، پاکستان

۲۔ ارمغان فارسی، ۲۰۰۲ء، گردآورندہ، تسبیحی، محمد حسین، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان، اسلام آباد

۳۔ ذکی، بہروز، ذکیہ، ھنوز در سفری، ۲۰۰۸ء، فکشن ہاؤس، لاہور، پاکستان

۴۔ صدیقی، احمد حسین، دبستانوں کا دبستان کراچی، جلد دوم، باراوّل ۲۰۰۵ء: قرطاس، کراچی، پاکستان

۵۔ صدیقی، احمد حسین، دبستانوں کا دبستان کراچی، جلد پنجم، باراوّل ۲۰۱۷ء: فضلی سنز، کراچی، پاکستان

۶۔ صدیقی، زبیدہ، یتفجر منہ الانھار، ۱۹۷۶ء، ایس۔ٹی پرنٹرز، راولپنڈی، پاکستان

مجلّے:

۱۔ واجد، مسرت، ۲۰۰۸، سہ ماہی الزبیر، شمارہ ۴: اردو اکیڈمی، بہاول پور

۲۔ فصلنامہ دانش، ۱۹۹۸ء، شمارہ زمستان ۵۱: مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان، اسلام آباد

۳۔ فصلنامہ دانش، سال، ۱۹۹۸ء، شمارہ بھار ۵۲: ------------------- ایضاً

(فصلنامہ دانش، سال، ۱۹۹۸ء، شمارہ: پاییز و زمستان ۵۵۔۵۶، -------- ایضاً

۴۔ فصلنامہ دانش، سال، ۲۰۰۵ء، شمارہ زمستان ۸۲: ____________ ایضاً

۵۔ فصلنامہ دانش، سال، ۲۰۰۷ء، شمارہ بہار ۸۸: ____________ ایضاً

۶۔ فصلنامہ دانش، سال، ۲۰۰۷، شمارہ تابستان ۸۹: ____________ ایضاً

۷۔ فصلنامہ دانش، سال، ۲۰۰۸ء، شمارہ زمستان ۹۱: ____________ ایضاً

۸۔ فصلنامہ دانش، سال، ۲۰۰۸ء، شمارہ پاییز ۹۴: ____________ ایضاً

۹۔ فصلنامہ دانش، سال ۲۰۰۹ء، شمارہ زمستان ۹۵: ،__________ ایضاً

Google/website

07/02/2020 urdupoint.com

۔ رضی الدین رضی، www.girdopesh.com06/02/2020

۔ صفدر ھمدانی، لندن، aalmiakhbar.com24/11/2016

۔ محمد راشد شیخ https://www.bhatkallys.com>articles

انٹرویو، ای۔میل، واٹس ایپ وغیرہ:

۔ انٹرویو، از ڈاکٹر رضیہ اکبر، مارچ ۲۰۲۱ء، بہ ذریعہ ٹیلی فون

- بہ ذریعہ Email.Id :amber.akhtar4@yahoo.com

۔ ذکیہ بہروز ذکی، آزاد دائرۃ المعارف

۔ (انٹرویو باواسطہ واٹس ایپ) ر۔ک C.V: ڈاکٹر فلیحہ زہرا کاظمی)

۔ (انٹرویو نیلما ناہید درانی بذریعہ واٹس ایپ، مؤرخہ ۲۷ نومبر ۲۰۲۱ء)

۔ (ر۔ک: نیلما درانی، اردو پوائنٹ urdupoint.com)

***

خراسان سے برصغیر تک
(سلسلۂ چشتیہ کا مختصر تعارف)

*ڈاکٹر شوکت حیات **ڈاکٹر محمد اکرم

From Khurasan to the Subcontinent
(A brief introduction of Silsila Chishtia)

Dr. Shaukat Hayat/ Dr. Muhammad Akram

Silsila Chishtia(spiritual lineage) is a Sunni Sufi order within the mystic Sufi tradition of Islam. Silsila Chishtia is Founded by Khwaja Abu Ishaq Shami Chishti. It derives its name from the village of Chisht near Herat. Silsila Chishtia is known for its emphasis on love, tolerance, and openness. The Chishti Order is primarily followed in Kharasan and the subcontinent. This order is widely active throughout the world today. Together with the spiritual orders of the Qadriya, Naqshbandia and Suhrawardiya, they are considered as the four main silsilas of the Ahl-e-sunnah wal jamaa't.

Though, arising in Afghanistan and spreading into Khurasan(modern day Iran), their major sphere of influence was Sub continent, where they wielded an immeasurable effect on the native population.

Key words: سلاسل، چشتیہ، مسلمان، برصغیر، شیخ، مرشد، طریقت، تصوف، بیعت

اگر مسلمانان پاک و ہند کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی روحانی

زندگی کی اصلاح وتربیت کا کام چھ سلسلوں یعنی چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ، قادریہ، شطاریہ اور نقشبندیہ نے انجام دیا۔لیکن ان میں بھی زیادہ شہرت اور مقبولیت چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ کو حاصل ہوئی۔سلسلہ چشتیہ کے بارے میں مزید بات کرنے سے پہلے لفظ 'سلسلہ' کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

علم لغت میں سلسلہ زنجیر کو کہا جاتا ہے۔(فیروز الدین، مولوی؛ص ۸۰۶)

خواجہ امام بخش مہاروی اپنی کتاب "مخزن چشت" میں 'سلسلہ' کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"سلسلہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی پیدائش سے قبل آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دادا حضرت عبدالمطلب نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی پشت سے چاندی کی ایک زنجیر نکلی ہے، جس کا ایک سرا آسمان پر ہے اور دوسرا حصہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے اور پھر دیکھا کہ وہ زنجیر درخت بن گئی اور وہ درخت نورانی اور تابندہ و درخشندہ ہے اور مغرب ومشرق کے لوگ اس کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔حضرت عبدالمطلب جب نیند سے بیدار ہوئے تو تعبیر دانوں کے پاس اس خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لئے گئے۔انہوں نے بتلایا کہ تمہاری نسل میں ایسی عظیم ہستی پیدا ہوگی کہ پورے مشرق ومغرب کے لوگ اس سے مستفیض ہوں گے۔یہی وجہ ہے کہ ہم ناکس اپنے شیخ سے تعلق پیدا کرتے ہیں اور شیخ اپنے شیخ سے تعلق پیدا کرتا ہے، حتیٰ کہ یہ سلسلہ حضور ﷺ تک جا پہنچا ہے۔چونکہ یہ فیض دست بدست ایک کڑی سے دوسری کڑی تک پہنچتا چلا آرہا ہے، اس لئے اس کو سلسلہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔" (مہاروری، خواجہ امام بخش؛ص ۷۹)

تصوف یا صوفیت کا نام پانے والوں میں بیبیوں ہی نہیں بلکہ کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ سینکڑوں طرق مروج ہیں۔(گیلانی، مناظر احسن؛ص ۲۳۳)

صوفیاء کے مشہور سلسلے کل چودہ ہیں جنہیں خانوادے کہا جاتا ہے۔نقشبندیہ سلسلے کے علاوہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے آنحضرت ﷺ تک پہنچتا ہے، باقی تمام سلسلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہو کر آنحضرت ﷺ سے ملتے ہیں۔(ہاشمی، حمید اللہ شاہ؛ص ۵۰)

سلسلہ چشتیہ کا مختصر تعارف:

برصغیر پاک وہند کے اندر سلاسل تصوف میں سلسلہ عالیہ چشتیہ کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں کئی خصوصیتیں ایسی تھیں جنہیں اس سرزمین کے حالات خاص طور پر سازگار تھے مثلاً موسیقی اور سماع کا رواج، ادبیت اور شعر وشاعری سے انس، ملائمت، غیر مسلموں کے ساتھ معمولی رواداری وغیرہ۔ان خصوصیتوں نے اس سلسلے کی مقبولیت اور اشاعت میں بڑی مدد دی۔نیز اس سلسلے کے بزرگوں نے مسلمانان پاک وہند کی روحانی تربیت میں بڑا اہم حصہ لیا۔

وجہ تسمیہ:

چشت نام کے دو مقام ہیں : ایک خراسان میں ہرات کے قریب اور دوسرا پاکستان میں اوچ اور ملتان کے درمیان واقع ہے۔خواجگان چشت خراسان والے چشت سے تعلق رکھتے ہیں۔کہتے ہیں کہ اس مقام پر کچھ بزرگان دین نے روحانی اصلاح وتربیت کا ایک بڑا مرکز قائم کیا تھا،جس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔بعدازاں وہ نظام اس مقام یعنی چشت کی نسبت سے چشتیہ سلسلہ کہلانے لگا۔(ہاشمی،حمیداللہ شاہ؛ص ۵۲)

بانی سلسلہ:

ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب کے مطابق معروف سلاسل طریقت میں سب سے قدیم سلسلہ قادریہ ہے،جس کے پیشوا حضرت محی الدین ابومحمد عبدالقادر گیلانی قدس سرہ ہیں۔(زریں کوب،دکتر عبدالحسین؛ص ۹۸)

لیکن پروفیسر لطیف اللہ کے مطابق یہ تحقیق درست نہیں ہے۔تاریخی تسلسل کے اعتبار سے جو سلسلہ سب سے پہلے معرض وجود میں آیا وہ سلسلہ چشتیہ ہے،جس کے بانی اول حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ (م ۳۲۹ھ) ہیں جب کہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا سال ولادت ۴۷۱ھ اور سال وفات ۵۶۱ھ ہے۔گویا آپ خواجہ ابو اسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ سے تقریباً ایک سو بیالیس سال بعد پیدا ہوئے۔(لطیف اللہ،پروفیسر؛ص ۲۱۳)

حضرت شیخ ابو اسحاق شامی مشائخ کبار میں سے گزرے ہیں۔(جامی،مولانا عبدالرحمٰن؛ص ۳۲۲)

آپ ملک شام میں پیدا ہوئے اور حق تعالیٰ کے غیبی حکم سے ملک شام جا کر حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری کی خدمت میں حاضر ہوئے،بیعت کی اور کچھ عرصہ زیر تربیت رہ کر خلافت حاصل کی۔روایت ہے کہ مرشد پاک کے استفسار پر جب آپ نے اپنا نام ابو اسحاق شامی عرض کیا تو حضرت شیخ علو دینوری نے فرمایا کہ آج سے تم ابو اسحاق چشتی کہلاؤ گے اور چشت کی خلقت تم سے ہدایت حاصل کرے گی اور جو شخص تمہارا مرید ہوگا اسے بھی قیامت تک چشتی کہا جائے گا۔چنانچہ بعد حصول خلافت جب آپ حسب ارشاد عازم چشت ہوئے تو خواجگان چشت وجود میں آئے۔(سیال،کپتان واحد بخش؛ص ۱۴۲،۱۴۳)الف

خواجہ ابو اسحاق ہمیشہ ریاضت میں مشغول رہتے۔سات روز کے بعد روزہ افطار کرتے اور تین چھوہارے کھاتے۔نادر طور پر کبھی تین لقمے کھانا کھالیتے تو فرماتے کہ ہمیں جو لذت بھوک میں آتی ہے کسی چیز میں نہیں آتی۔بھوک پیاس کو برداشت کرنا اور (بے ضرورت لباس سے) عریاں رہنا،انبیاء و اولیاء کا معمول ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اپنے پیٹوں کو بھوکا،جگروں کو پیاسا اور بدنوں کو بے لباس رکھو،گمان غالب ہے کہ دیدار الٰہی (کی دولت) پاسکو گے۔(بلگرامی،میر عبدالواحد؛ص ۴۲۰،۴۲۱)

خرقہ خلافت پہننے کے بعد حضرت ابو اسحاق ہر وقت روتے رہتے۔لوگوں نے منع کیا کہ یا شیخ! رویا نہ کریں،کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ رونے کے سبب آنکھوں کی بینائی جاتی رہے۔یہ بات سن کر آپ نے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے۔جب ہوش میں

آئے تو لوگوں نے نعرہ مارنے اور رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا : محب قیدی ہوتا ہے، پرواز نہیں کر سکتا۔ اس واسطے نعرے مارتا ہوں اور ہر دم روتا ہوں کہ اس کوشش سے وہاں پہنچ جاؤں اور اس تاریکی سے آزاد ہو جاؤں۔ (صابری، صاحبزادہ مقصود احمد؛ ص ۴۷)

مقام عکہ (شام) میں ۱۴ ربیع الثانی ۳۲۴ھ میں آپ عالم بالا کی طرف رجوع فرما ہوئے۔ (سیالوی، سید محمد ذاکر حسین شاہ؛ ص ۲۳۳)

مزار مبارک عکہ میں ہے جو ملک شام میں ہے اور جسے اہل یورپ ACRE کہتے ہیں۔ وصال کے وقت ہر شب، شام سے صبح تک ایک چراغ آپ کے مزار پر غیب سے روشن ہو جاتا ہے جس کو کوئی آندھی، طوفان اور بارش نہیں بجھا سکتی۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

(سیال، کپتان واحد بخش؛ ص ۱۴۱) الف

برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ چشتیہ کا اجراء:

سلسلہ چشتیہ کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیازی شان یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلامی تعلیم کی تنظیم و تبلیغ کی بنیاد ہندوستان میں اسی کے ذریعہ ہوئی وحید احمد مسعود لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں قرآنی علوم کی پوری قوت کے ساتھ چھان بین کی جا چکی تھی۔ حدیثوں کی تنقیح ہو چکی تھی۔ فقہ کے اصول ضبط کر لئے گئے تھے اور دماغی ورزشوں کے لئے عقلی و ادبی علوم کے دروازے کھل چکے تھے۔ لہٰذا ہندوستان میں چشتیوں نے سارا زور عمل و اخلاص پر صرف کیا۔ یہی ان کی تعلیم کا لب لباب ہے اور یہی ان کی بالغ نظری کا ثبوت ہے، جس کی وجہ سے ولایت ہند کی روحانی تربیت ان کے سپرد ہوئی۔" (مسعود، وحید احمد؛ ص ۴۷، ۴۸)

کپتان واحد بخش سیال رقمطراز ہیں:

"ویسے تو برصغیر میں دیگر سلاسل مثلاً سلسلہ عالیہ قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ کے بزرگان دین نے بھی کافی لوگوں کی ہدایت و اصلاح میں حصہ لیا لیکن دراصل یہ ملک چشتیوں کا ورثہ ہے اور سلسلہ عالیہ چشتیہ کو برصغیر میں جو عدیم المثال کامیابی حاصل ہوئی ہے، وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسبت چشتیہ یعنی شدید نسبت عشقیہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔" (سیال، کپتان واحد بخش؛ ص ۲۴) ب

تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ سلسلہ چشتیہ کو پاک و ہند میں جاری کرنے کا شرف حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو حاصل ہے۔

An Introduction to The History of Sufism میں لکھا ہے:

"It was introduced in to India in 1192 by Khawajah Muinal-Din Chishti of Sistan.)" Arberry, A.J; P xi)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رقمطراز ہیں:

"آپ برصغیر پاک وہند میں بڑے بڑے مشائخ کے سرحلقہ اور سلسلہ چشتیہ کے بانی ہیں۔ (دھلوی، شیخ عبدالحق محدث؛ ص ۲۲) حضرت خواجہ معین چشتی اجمیری ۵۳۷ھ میں ایران کے علاقہ سیستان میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب گیارہ واسطوں سے سید الشہداء، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ پندرہ سال کے تھے کہ والد ماجد نے انتقال فرمایا۔

حافظ پروفیسر احمد بخش یوں رقم طراز ہیں:

"آپ کا ایک باغ تھا جس کی آمدنی سے بسر اوقات ہوتی تھی۔ وہاں ایک مجذوب رہتے تھے جن کا نام ابراہیم تھا۔ ایک دن ان کا گزر حضرت خواجہ بزرگ یعنی خواجہ معین الدین چشتی کے باغ سے ہوا۔ آپ نے ان کو نہایت عزت وتکریم سے درخت کے نیچے بٹھایا اور انگوروں کا خوشہ پیش کیا اور خود ادب سے ان کے پاس بیٹھ گئے۔ ابراہیم نے بغل سے کھلی نکالی اور چبا کر خواجہ بزرگ کے منہ میں ڈال دی۔ اس کے کھاتے ہی آپ کے سینہ میں نور معرفت موجزن ہوا اور آپ کا دل گھربار، املاک سے سرد ہوگیا اور تین دن میں سب کچھ فروخت کر کے فقراء میں تقسیم کر دیا۔ اسی وقت آپ نے تجرید میں قدم رکھا اور طلب حق کے لئے سفر اختیار کیا۔ مدت تک آپ سمرقند اور بخارا میں رہے۔ کلام پاک حفظ کیا اور ظاہری علم حاصل کیا۔ (سیال، کپتان واحد بخش؛ ص ۱۵۲) الف۔ تعلیم کے بعد عراق تشریف لے گئے جہاں حضرت خواجہ عثمان ہارونی سے بیعت ہوئے۔" (احمد بخش، حافظ پروفیسر؛ ص ۱۲۹)

منقول ہے کہ شیخ الاسلام معین الدین قدس اللہ سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے کہ جب میں خواجہ عثمان ہارونی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان بزرگ کی بیعت سے مشرف ہوا تو میں بیس سال تک ان کی خدمت میں رہا۔ اس بیس سال کے عرصہ میں میں ایک لمحہ بھی ان کی خدمت سے غافل نہیں رہا۔ سفر وحضر میں ان کا بستر اور سامان ساتھ لے کر چلتا تھا۔ جب آپ نے میرے خلوص اور خدمت کو پوری طرح محسوس کر لیا تو اس وقت حضرت خواجہ عثمان ہارونی نے اپنے کمال کی نعمتوں سے مجھے سرفراز فرمایا۔ (امیر خورد؛ ص ۱۲۷)

T.W.Arnold لکھتے ہیں :

He was a native of Sajistan to the east of Persia, and is said to have

received his call to preach Islam to the unbelievers in India while on a pilgrimage to Madina. Here the Prophet appeared to him in a dream and thus addressed him: "The Almighty has entrusted the country of India to thy. Go thither and settle in Ajmir. By God's help, the faith of Islam shall, through thy piety and that of thy followers, be spread in that land." He obeyed the call and made his way to Ajmir which was then under Hindu rule and idolatory prevailed throughout the Land.)Arnold, T.W; P 284)

آپ کا وصال التمش کے دور میں ۶ رجب ۶۳۳ ھ کو ہوا۔عمر مبارک ۹۷ برس تھی۔جس روز وصال ہوا،اس شب اکثر اہل اللہ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ مع اصحاب تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں:

"خدا کا دوست معین الدین دنیا سے آتا ہے اس کا استقبال ضروی ہے"۔(احمد بخش،حافظ پروفیسر؛ص ۱۲۹)

نواز رومانی رقمطراز ہیں:

"طائر وقت تیزی سے محو پرواز رہا اور جب مقصد حیات کے حصول میں حضرت خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ سرخرو ہو گئے تو فانی سے باقی دنیا کی طرف سفر کرنے کا پیغام آ گیا۔دم آخر رب ذوالجلال کی خوشنودی کی سند ان کی جبین اقدس پر بہ حروف ذیل چمک رہی تھی :

"ھذا حبیب اللہ مات فی حب اللہ"۔(رومانی،نواز؛ص ۸)

سلسلہ چشتیہ کی خصوصیات:

تذکرہ چشتیہ شمسیہ میں سلسلہ چشتیہ کی درج ذیل خصوصیات بیان کی گئی ہیں :

۱۔ سنت کے مطابق کسی جگہ کو منتخب کر کے دعوت الی اللہ کا مرکز بنانا۔

۲۔ ماسوی اللہ سے دل موڑ کر اللہ تعالیٰ سے جوڑنا اور اس کے لئے صفائے باطن کا راستہ اختیار کرنا۔

۳۔سلسلہ چشتیہ پر مستحکم رہتے ہوئے شکوک وشبہات سے بچنا۔

۴۔ ریاضت سے منہ نہ موڑنا۔

۵۔استغنا اور فقر کو غنا سے فاضل سمجھنا

۶۔مہمان کی خدمت کرنا

۷۔سماع اور اہل سماع کو عزیز جاننا

۸۔مشائخ کے عرس شوق وذوق سے کرنا

۹۔لوگوں کو اپنے آپ سے افضل سمجھنا

۱۰۔سب سے حسن سلوک کرتے ہوئے صلح کل کو اپنانا

۱۱۔وحدت الوجود پر مہارت مگر عوام سے اخفاء

۱۲۔کثرت میں وحدت کا مشاہدہ

۱۳۔ذکر وہ ہو کہ شروع ہو تو موت تک ساتھ رہے۔ہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ختم کرنے کا اشارہ ہو تو اور بات ہے

۱۴۔صحو و سکر مل کر چلیں،صرف سکر کی نذر نہ ہوں

۱۵۔تواضع،اخلاق حمیدہ اور عقل کا ساتھ رہے

۱۶۔علم لدنی کے موصوف بن کر حضور دل کی دولت سے مالا مال ہوں

۱۷۔سب سے اہم یہ کہ اتباع رسول علیہ السلام اور سرکار عرش وقار کی محبت ہر بات پر حاوی رہے (سیالوی،سید محمد ذاکر حسین شاہ؛ ص ۲۳۲،۲۳۳)

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"اس سلسلے کی امتیازی خصوصیت سماع کا رواج ہے۔حضرات چشت پر سماع کے وقت ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بسا اوقات اس سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں۔چشتی درویش بالعموم رنگ دار کپڑے پہنتے ہیں اور ان میں زیادہ تر ہلکے بادامی رنگ کو ترجیح دیتے ہیں۔" (محمد اکرام،شیخ؛ص ۲۵۳)

سلسلہ چشتیہ کی دو ذیلی شاخیں ہیں:

۱۔سلسلہ نظامیہ ۲۔سلسلہ صابریہ

۱۔سلسلہ نظامیہ:

اس سلسلہ کے بانی حضرت سلطان المشائخ مورد فیوض نامتناہی،محبوب الٰہی،واقف راز لا مکانی،عارف اسرار یزدانی،قدوۂ ابرار،عمدۂ اخیار قدس سرہ ہیں۔(چشتی،مولوی احمد علی؛ص ۱۴۷)

شیخ الشیوخ سلطان الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی ولادت باسعادت ۶۳۶ھ کو ہوئی۔(سیالوی،سید محمد ذاکر حسین شاہ؛ص ۳۳۹)

آپ کا اسم گرام نظام الدین محمد اور لقب سلطان المشائخ اولیاء اور محبوب الٰہی ہے۔آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی سید احمد تھا،جو سادات حسینی میں سے تھے۔آپ بدایوں میں پیدا ہوئے اور بارہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔بیس برس کی عمر میں پاکپتن شریف حاضر ہو کر حضرت بابا فرید الدین گنج شکر سے بیعت ہوئے۔خلافت حاصل کی اور مرشد کے حکم کے مطابق دہلی

تشریف لائے اور غیاث پور کو مرکز بنا کر بیٹھ گئے، جہاں ساری عمر رشد و ہدایت میں گزاری۔ آپ نے بہت سخت مجاہدات کیے اور لاتعداد مخلوقات آپ سے فیض یاب ہوئی۔ آپ کا وصال ۱۷ ربیع الثانی ۷۲۰ھ کو ہوا۔ مزار مبارک دہلی میں مرجع خلائق ہے۔

سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی لکھتے ہیں:

"حضرت نظام الاولیاء نے اپنی حیات طیبہ میں معاشرے کو خالص اسلامی رنگ میں رنگ دیا۔ شاہوں کی مخالفت کو پرکاہ کی حیثیت نہیں دی۔ عوام میں گھل مل کر ان کی دستگیری فرمائی۔ سلسلہ ولایت کو ملک میں پھیلا دیا اور ان کی مساعی سے سلسلہ کی خانقاہوں نے نورِ اسلام اور اخلاق محمدی کا وہ گلشن لگایا جس کی بہاروں اور رعنائیوں سے لوگوں کے قلوب و اذہان منور و معطر ہو گئے۔ اس عظیم المرتبت بوریا نشین نے رحمت عالم ﷺ کی مسجد نبوی کی بوریا نشینی کی یاد تازہ کر دی اور سنت محمدی اور مساوات احمدی کا جھنڈا بھارت کے اس ظلمت کدے میں گاڑ دیا جہاں ذات پات کے نشیب و فراز کے گڑھوں میں گر کر انسانیت بلک رہی تھی۔ معین الملت، قطب عالم اور فرید دوراں علیہم الرضوان کے مشن کو آگے بڑھانے کا حق ادا فرما دیا۔ تعلیمات قرآن کو زندگی کا قالب عطا فرما دیا۔ بت کدۂ ہند میں توحید کے نعرے بلند کر دیے۔" (سیالوی، سید محمد ذاکر حسین شاہ؛ ص ۳۵۲)

حضرت محبوب الٰہی کو نظام الدین اولیاء کیوں کہا جاتا ہے، یہ جان لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی نے لکھا ہے کہ ابو علی قلندر فرماتے ہیں:

"نظام الدین ولی نیست بلکہ اولیاء ہست، یعنی صاحب یک ولایت فقط نیست صاحب ولایات متعدد ہست۔" (گولڑوی، پیر مہر علی شاہ؛ ص ۹۶)

(نظام الدین ایک ولی نہیں ہے بلکہ بہت سے ولی ہیں، یعنی وہ ایک ولایت کے مالک نہیں بلکہ کئی ولایتوں کے مالک ہیں)

برصغیر پاک و ہند میں بہت سی ایسی خانقاہیں ہیں جن کا تعلق سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ سے ہے اور جنہوں نے تبلیغ و اشاعت اسلام میں نہایت اہم خدمات سرانجام دیں۔ مثلاً مہار شریف، تونسہ شریف، سیال شریف، جلال پور شریف، گولڑہ شریف، بھیرہ شریف وغیرہ۔

۲۔ سلسلہ صابریہ:

یہ خانوادہ مقتدائے طریق، رہنمائے تخلیق، کشاف دقائق عرفانی، صراف نشو رحمانی، عارف شان جلال، واقف برہان کمال، مشہدی راہ مستقیم، برقدم حضرت موسیٰ کلیم، عمدہ اکابر مخدوم سید علاء الدین علی احمد صابر کلیری سے منسوب ہے۔ آپ حضرت مسعود گنج شکر کے مرید بھی تھے، مجاز بھی، خواہر زادہ بھی تھے اور داماد بھی تھے۔ آپ کو سلوک و طریقت میں بڑی شان و شوکت

حاصل تھی۔ان کے اکثر حالات مستور تھے۔حضرت شیخ کبیر مسعود گنج شکر آپ پر خصوصی نظر عنایت فرمایا کرتے تھے۔اگر چہ حضرت مسعود گنج شکر کے خلفاء اور تربیت یافتگان کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہوسکی اور ان کا حد وحساب نہیں پایا جاتا مگر ان دو حضرات سے (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور حضرت علی احمد صابر کلیری) سے آپ کا سلسلہ کائنات ارض میں پھیلا اور فریدی تعلیمات کو بڑا فروغ ملا۔(چشتی،مولوی احمد علی؛ص ۱۴۹)

حضرت علاء الدین علی احمد صابر نے ۱۹ ربیع الاول ۵۹۲ھ کو ہرات میں اس عالم کو زینت بخشی۔

آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد (عبدالرحیم) کے سائے میں ہوئی۔والد کے انتقال (۵۹۷ھ) کے بعد آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی تعلیم وتربیت پر کافی توجہ دی۔اجودہن میں آپ کی تعلیم وتربیت حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی نگرانی میں ہوئی۔عربی،فارسی کے علاوہ آپ نے فقہ،حدیث،تفسیر،منطق،معانی وغیرہ میں دستگاہ حاصل کی۔

ڈاکٹر ظہور الحسن شارب لکھتے ہیں:

"آپ میں شان جلالی بدرجہ اتم تھی۔آپ کو نسبت فنا اعلیٰ درجہ کی حاصل تھی۔ریاضت،عبادت اور مجاہدہ میں ہمہ تن مشغول رہتے تھے۔آپ کے پیر ومرشد حضرت بابا فرید الدین گنج شکر آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔آپ روزے بکثرت رکھتے تھے۔آپ کو بارگاہ ایزدی میں مقبولیت حاصل تھی۔آپ کی دعا قبول ہوتی تھی۔آپ ۱۳ ربیع الاول ۶۹۰ھ کو واصل بحق ہوئے۔آپ کا مزار پرانوار کلیر میں فیوض وبرکات کا سرچشمہ ہے۔" (شارب،ڈاکٹر ظہور الحسن؛ص ۷۲،۷۳)

برصغیر پاک وہند میں تبلیغ اسلام کے حوالے سے سلسلہ عالیہ صابریہ کے مشائخ کی خدمات بھی نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

کتابیات:

- احمد بخش،حافظ پروفیسر؛(۲۰۰۳ء)،جمال کرم،ج ۱،اشاعت اول،ضیاء القرآن پبلی کیشنز،لاہور۔
- امیر خورد؛(۱۹۸۶ء)،سیر الاولیاء،اردو ترجمہ :اعجاز الحق قدوسی،اشاعت دوم،اردو سائنس بورڈ،لاہور۔
- بلگرامی،میر عبدالواحد؛(۱۹۹۹ء)،سبع سنابل،اردو ترجمہ : مفتی محمد خلیل خان برکاتی،اشاعت دوم،حامد اینڈ کمپنی،لاہور۔
- جامی،مولانا عبدالرحمٰن؛(س ن)،نفحات الانس،انتشارات کتاب فروشی محمودی،تہران۔
- چشتی،مولوی احمد علی؛(۱۹۸۸ء)،قصر عارفاں،اردو ترجمہ وترتیب :علامہ اقبال احمد فاروقی،مکتبہ مظہر فیض رضا،برج منڈی۔
- دہلوی،شیخ عبدالحق محدث؛(س۔ن)،اخبار الاخیار مع مکتوبات،مکتبہ نوریہ رضویہ،سکھر۔
- رومانی،نواز؛(۲۰۰۱ء)،شاہ اجمیر،ضیاء القرآن پبلی کیشنز،لاہور۔
- زریں کوب،دکتر عبدالحسین؛(۱۳۴۲ش)،ارزش میراث صوفیہ،انتشارات آریا،تہران۔

- سیال، کپتان واحد بخش؛ (۲۰۰۲ء)، حیات وتعلیمات حضرت خواجہ غلام فرید، اشاعت اول، محکمہ اوقاف، حکومت پنجاب، لاہور۔الف
- سیال، کپتان واحد بخش؛ (۲۰۰۰ء)، مقام گنج شکر، اشاعت دوم، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور۔ب
- سیالوی، سید محمد ذاکر حسین شاہ؛ (۲۰۰۳ء)، تذکرہ چشتیہ شمسیہ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔
- شارب، ڈاکٹر ظہور الحسن؛ (س۔ن)، تذکرہ اولیائے پاک وہند، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور۔
- صابری، صاحبزادہ مقصود احمد؛ (۱۹۹۷ء)، تذکرہ خواجگان چشت اہل بہشت، اشاعت اول، نوری کتب خانہ، لاہور۔
- فیروز الدین، مولوی؛ (س۔ن)، فیروز اللغات اردو جامع، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔
- گولڑوی، پیر مہر علی شاہ؛ (۱۹۹۸ء)، مکتوبات طیبات، گولڑہ شریف۔
- گیلانی، مناظر احسن؛ (۱۹۵۹ء)، مقالات احسانی، ادارہ مجلس علمی، کراچی۔
- لطیف اللہ، پروفیسر؛ (۱۹۹۶ء)، تصوف اور سریت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔
- محمد اکرام، شیخ؛ (۱۹۸۶ء)، آب کوثر، اشاعت یازدھم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔
- مسعود، وحید احمد؛ (۱۹۹۴ء)، سیرت خواجہ معین الدین چشتی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔
- مہاروی، خواجہ امام بخش؛ (۱۹۸۹ء)، مخزن چشت، اردو ترجمہ : پروفیسر افتخار احمد چشتی چشتیہ اکادمی فیصل آباد۔
- ہاشمی، حمید اللہ شاہ؛ (۲۰۰۰ء)، احوال وآثار حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، تصوف فاؤنڈیشن، لاہور

Arberry, A.J; An Introduction to The History of Sufism, Longmans, Green and Co. New York.

Arnold, T.W;(1961 A.D(, The Preaching of Islam, Sh. Muhammad Ashraf Publisher& Booksellers, Lahore.

***

سندھ کے فارسی کتب تواریخ کا اجمالی جائزہ

*مرزا کاظم رضا بیگ

An overview of Sindh books and chronicles

Mirza Kazim Raza Baig

The land of Mehran has been the cradle of civilization since ancient times. Most of the regions of the planet were still in the early stage of barbaric life where civilization had developed to an enviable extent. The boundaries of this region were also wider than today, but even modern research does not go further than that when the Aryans stepped into this valley, they called this region Sindhu in terms of the river, because this is the word for the river. It was used for With the Greeks, this word became"Indus" and in fact the Indus of that time was limited to the same region of land, which was irrigated by the Indus River. But how surprising that the pages of history are empty from the conditions of the early period. From archeology, one can make a sketch of their mental superiority, but they find their libraries empty of the histories of that time. The oldest books are also those which were written after the arrival of Muslims here.

مہران کی سرزمین قدیم ترین زمانے سے تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہی ہے۔ابھی کرۂ ارض کے بیشتر خطے وحشیانہ زندگی کے ابتدائی دور میں ہی تھے کہ یہاں تمدن نے قابل رشک حد تک ترقی کرلی تھی۔اس خطے کے حدود بھی آج سے زیادہ وسیع تھے، بلکہ جدید تحقیق بھی اس سے آگے قدم نہیں بڑھاتی کہ آریوں نے جب اس وادی میں قدم رکھا تو

*ادیب ومحقق، ٹنڈو آغا، حیدرآباد، سندھ

اس خطہ ملک کو دریا کے لحاظ سے سندھو کہا، کیونکہ یہی لفظ ان کے ہاں دریا کے لئے مستعمل تھا۔ یونانیوں کے ہاں یہ لفظ انڈس Indus ″ ہوگیا اور حقیقت میں اس وقت کا انڈس اسی خطۂ زمین تک محدود تھا، جسکو دریائے سندھ سیراب کرتا تھا۔ لیکن کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ابتدائی دور کے حالات سے تاریخ کے صفحات خالی ہیں۔ ہم آثار قدیمہ سے ان کی ذہنی برتری کا ایک خاکہ تو بنا سکتے ہیں۔ مگر اپنے کتب خانوں کو اس وقت کی تاریخوں سے خالی پاتے ہیں۔ قدیم ترین کتابیں بھی وہ ہیں جو یہاں مسلمانوں کی آمد کے بعد لکھی گئیں۔

تاریخ سندھ میں عربوں کا حصہ

سندھ میں ابتدائی اسلامی فتوحات کا دور پہلی صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے، مگر عرب مورخین کی کتابیں تیسری صدی ہجری کے آخر یا اس کے لگ بھگ لکھی گئی ہیں۔ اس طرح ہمیں کوئی مورخ ایسا نہیں ملتا جو خود ان مہمات میں ذاتی طور پر شریک رہا ہو یا کم از کم وہ واقعات اس کی زندگی میں ہی گذرے ہوں۔

علاوہ ازیں اس وقت کسی ایسی عربی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا جو صرف سندھ کی فتوحات اور یہاں کے واقعات پر مشتمل ہو۔ ہوا یہ ہے کہ عرب مورخین نے اسلامی فتوحات کے ضمن میں سندھ اور مکران کی فتوحات کا بھی ذکر کر دیا ہے اور وہ بھی نہایت مختصر اور چونکہ یہ تاریخیں اصل فتوحات کے تقریباً دو سو برس بعد لکھی گئیں، اس لئے روایت کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے، لیکن ان میں بھی اکثر بیچ کی کڑیاں غائب ہیں۔

اس اوائل عہد میں وہ مورخ جس کی خلافت اسلامیہ کے مشرقی ممالک پر گہری نظر تھی، المدائنی (۱۲۵-۲۲۵) ہے۔ مدائنی کا پورا نام ابوالحسن علی بن محمد بن عبداللہ بن ابی سیف المدائنی ہے۔ اس نے مشرقی ممالک کی فتوحات پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ مثلاً کتاب فتوح العراق، کتاب فتوح خراسان، کتاب فتوح الأبلة، کتاب عمان، کتاب امیر البحرین، کتاب کرمانی، کتاب فتوح سجستان، کتاب کامل روز ابلستان، کتاب فتح مکران، کتاب ثغر الہند، کتاب عمال الہند مگر دستبرد زمانے نے ان کتابوں کو ناپید کر دیا ہے، جس کی وجہ سے ہم مسلمانوں کی مشرقی فتوحات سے کما حقہ واقف نہیں۔

مدائنی کے بعد جن عرب مورخین نے سندھ اور ھند کی اسلامی فتوحات پر قلم اٹھایا ہے

ان میں قابل ذکر ابوحنیفۃ الدینوری، بلاذری، یعقوبی اور طبری ہیں۔ ان سب مورخین کی تصنیفات تیسری صدی ہجری کی چوتھائی آخری زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۱) ابوحنیفہ الدینوری (متوفی جمادی الاول 282) کی کتاب ''کتاب اخبار الطوال'' میں سندھ کی بابت نہایت مختصر حالات ہیں، مگر ان میں بھی کوئی اہم بات نہیں۔

(۲) احمد بن یحیی بن جابر داؤد الکاتب البغدادی جو البلاذری کے نام سے مشہور ہے، اسکی شہرہ آفاق تاریخ ''فتوح البلدان'' میں ایک خاص باب ''فتوح السندھ'' پر بھی ہے، جو تقریباً 15 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں واقعات دوسری تاریخوں سے زیادہ مفصل ملتے ہیں۔ بلاذری کے زاویوں میں مدائنی کا نام بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بلاذری کی وفات سنہ 279/280ع میں ہوئی۔

(۳) احمد بن ابی یعقوب اسحاق بن جعفر بن وہب بن واضع الکاتب العباسی الاصبہانی (م۔284) جو یعقوبی کے نام سے مشہور ہے اسکی کتاب ''التاریخ الکبیر'' میں (جسکو تاریخ یعقوبی بھی کہتے ہیں) محمد بن قاسم کے تفصیلی حالات کے ساتھ ان عرب عالموں کے حالات بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً سندھ میں متعین ہو کر آئے۔

(۴) ابوجعفر محمد بن جریر الطبری (م۔310) نے اپنی کتاب ''تاریخ الرسل الملوک'' (تاریخ طبری) میں سب سے زیادہ تفصیلی حالات (221-238) لکھے ہیں۔

انکے علاوہ اور مورخین بھی ہیں جنہوں نے سندھ کے اوائلی اسلامی فتوحات پر قلم اٹھایا ہے۔ مثلاً ابن اثیر، ابن خلدون، ابن سعد، ابن خرداذبہ، اصطخری، مسعودی وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان کے ماخذ بھی وہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس لئے محمد بن قاسم کے حملے سے لیکر سبکتگین کے وقت تک کے ہمیں سندھ کے حالات قابل ذکر کتابوں میں نہیں ملتے اور جو کتابیں ہیں وہ بعد کے زمانے میں لکھی گئی ہیں۔

سلطان محمود غزنوی سے لیکر مغل بادشاہوں کے زمانۂ عروج تک سندھ کا صوبہ بیشتر دہلی کی مرکزی حکومت کے زیر اقتدار رہا۔ البتہ ایسا ہوتا رہا کہ مرکزی حکومت میں جب ضعف آیا تو دوسرے صوبوں کو آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا مگر جب کبھی دہلی کی حکومت کسی طاقتور کے ہاتھ آئی تو اس وقت صوبوں کو پھر مرکزی اقتدار کے آگے سر کہ جھکانا پڑا۔ یہی حال سندھ کا رہا۔ سمہ اور سومروں نے آزادی سے حکومت کی، مگر ان میں کچھ ایسے تھے جو شاہانِ دہلی کے باجگذار رہے۔ یہ خود مختار حکمران بھی صرف تلوار کے ہی دھنی تھے۔ علم وفن کا میدان ان کی تگ وتاز سے بالکل محروم رہا۔ ہمیں کسی ایسی تاریخی کتاب کا پتہ نہیں چلتا جو ان کے عہد میں تصنیف کی گئی ہو۔

سلطان محمود غزنوی کا معاصر ابوریحان بیرونی علم وفعل میں یکتائے روزگار سمجھا جاتا ہے۔ وہ ھندوستان میں

آیا سنسکرت زبان سیکھی اور بقول خود، اس نے سنسکرت کی دو کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ اس نے یہاں کے حالات اور ھندوؤں کے رسم و رواج پر ایک کتاب لکھی، جسکا نام تاریخ الھند ہے۔ یہ کتاب 1031ء کے لگ بھگ لکھی گئی۔ البیرونی کی اس کتاب میں سندھ کے بعض شہروں کے متعلق تھوڑا سا حال ملتا ہے۔

سلطان محمود غزنوی کے عہد سے سلطان ناصر الدین محمود تک تقریباً ایک درجن سے زیادہ تاریخیں لکھی گئیں اور ہر تاریخ کسی نہ کسی بنا پر خاص اہمیت کی مالک ہے۔ مگر ان میں سے جن تاریخوں میں سندھ کے معتبر اور اکثر چشم دیدہ حالات ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

جمعیت الحکایات، تالیف مولانا نور الدین محمد عوفی ہمعصر شمس الدین التمش بہ کتاب سنہ 607 / 1211ء میں تصنیف کی گئی۔ دوسری کتاب طبقات ناصری ہے جو منہاج الراج کی تصنیف ہے۔ منہاج الراج نے اپنی اس تاریخ کا نام اپنے مربی سلطان ناصر الدین محمود کے نام پر رکھا اور یہ تاریخ اس بادشاہ کی حکومت کے آخری سالوں میں لکھی گئی۔ ان دونوں کتابوں میں دراصل شاہان دہلی کا قطب الدین سے لے کر ناصر الدین محمود تک کا ذکر ہے۔ مگر چونکہ سندھ ان کے زیر تصرف رہا اس لئے سندھ سے متعلق واقعات کا درج ہونا بھی ناگزیر تھا۔ قطب الدین ایبک نے ناصر الدین قباچہ کو سندھ اور ملتان پر مقرر کیا گیا تھا۔ ایبک کے انتقال پر ناصر الدین نے خود مختاری کا اعلان کیا اور اسطرح اسکو اپنے حریف شمس الدین التمش کے ہاتھوں اپنی جاں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مگر قباچہ خود بڑا علم و فضل کا سرپرست تھا۔ اور اس تھوڑے سے عرصے میں سندھ بھی بڑے بڑے علماء اور فضلا کا مسکن بن گیا تھا، جو دور دراز ملکوں سے آکر یہاں بس گئے تھے۔

ناصر الدین قباچہ کے زمانے میں سندھ کے حالات پر ایک کتاب عربی سے فارسی ترجمہ کی گئی، جس کا اصلی نام فتحنامہ ہے، مگر شہرت چچ نامہ کے نام سے ہوئی۔ اس کتاب کو محمد علی بن حامد بن ابوبکر کوفی نے سنہ 612ھ میں ترجمہ کیا۔ اب تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اصل عربی کتاب کب اور کسی نے لکھی۔ البتہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ اصل عربی کتاب 225ھ و سے لیکر ۴۰۰ھ کے درمیانی حصہ میں کسی وقت لکھی گئی ہے۔

گو اس کتاب کا تعلق ایک محدود تاریخی زمانہ سے ہے۔ یعنی چچ سے لیکر محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ اور پھر اسکی عبرت انگیز مدت تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ مگر یہ واقعات اس تفصیل کے ساتھ دیئے گئے ہیں کہ اس کتاب کو ممتاز حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ہر لڑائی کی جزئیات اور حجاج اور محمد بن قاسم کے درمیان خط و کتابت کا مکمل ریکارڈ موجود ہے، لیکن یہ بات یقیناً قابل افسوس ہے کہ تاریخی مواد کے ساتھ اس کتاب میں قصے اور رومانی داستانیں بھی شامل ہوگئی

ہیں ۔علی کوفی نے جا بجا عبارت آرائی سے کام لیا ہے اور غیر معتبر روایات کو بھی کتاب میں جگہ دی ہے، مگر اس کے باوجود یہ کتاب اپنی جگہ پر نہایت اہمیت رکھتی ہے۔

سلطان ناصر الدین محمود سے لیکر اکبر تک بیسیوں تاریخیں شاہانِ دہلی کے متعلق لکھی گئیں ہیں، جن میں ضمناً سندھ کا بھی ذکر آیا ہے۔ان میں اکثر کتابیں نہایت اہم بھی ہیں ۔مثلاً حسن نظامی کی تاج المعاصر (602- 1205)منہاج السراج کی طبقات ناصری (664-1266)ضیاء برنی اور شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی ،یحیی بن احمد بن عبداللہ سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی وغیرہ ۔مگر ان کتابوں کا ذکر سندھ کے بجائے ھند کے ذیل میں کرنا چاہئے،گو ان تاریخوں میں سندھ کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے ابن بطوطہ بھی اپنے دوران سفر(1325- 1354) میں سندھ سے گذرا اور اس نے سندھ کے متعلق جو کچھ حالات لکھے وہ معتبر اور دلچسپ ہیں ۔مذہبی اعتبار سے اکبر کا عہد کیسا ہی پرآشوب ہو مگر علم وفضل اور فنون لطیفہ کی قدردانی میں وہ دنیا کے کسی جلیل القدر بادشاہ سے کم نہیں ۔اس نے ہند اور ایران اور توران کے علماء فضلا اور شعراء کو اپنے دربار میں یکجا کرلیا تھا۔اسکے وزیر اور سپہ سالار خود علم وفضل کے بڑے سرپرست تھے ۔عبدالرحیم خانخانان، خان اعظم کوکلتاش اور مان سنگھ خود شاہوں سے بڑھ کر قدردانی کرتے تھے ۔ اکبر کے عہد حکومت میں بہت سی تاریخیں لکھیں گئیں جس میں اکبر نامہ، آئین اکبری ،تاریخِ فرشتہ، ماثر الامرا، ماثر رحیمی اور منتخب التواریخ سرفہرست ہیں ۔ان تمام کتابوں سے اس زمانے میں سندھ کے حالات کا بخوبی پتہ چلتا ہے ۔مگر زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس فرمانروا کے زمانے میں یا اسکے فوری بعد ایسی تاریخیں لکھی گئیں جن کا تعلق خاص سندھ سے ہے ۔سب سے پہلے میر معصوم بکھری نے تاریخ سندھ (۱۶۰۰) لکھی ۔سندھ کی ایک اور تاریخ جو (1030-1621) میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچی ،وہ تاریخ طاہری ہے ۔تاریخ طاہری کا مصنف میر طاہر محمد نسیانی ابن سید حسن ٹھٹھری ہے یہ تاریخ شاہ مگر بیگ عادل خان ارغوں کے نام پر معنوں ہے ۔میر طاہر نے ارغون اور ترخان حکمرانوں کی سرپرستی میں عمر بسر کی ۔ کتاب کا انداز خشک اور الجھا ہوا ہے ۔اسکے علاوہ زبان میں تصنع اور تکلف سے کام لیا گیا ہے، جو تاریخی کتابوں کے لئے قطعی موزون نہیں ۔یہ تاریخ سنہ 1021ھ پر یعنی میرزا غازی بیگ کی موت پر ختم ہوتی ہے ۔اس تاریخ میں تحقیقی عنصر کی بہت کمی ہے، اس لئے رطب و یابس جمع ہوگیا ہے ۔خاص طور پر سنوں میں کافی غلطیاں ہیں ۔مصنف کے کہنے کے مطابق کتاب کے دس ابواب (طبقات) ہونے چاہئیں ۔جبکہ اصل میں صرف چار ہی ہیں ۔پہلا باب سومرا خاندان کے بارے میں 16 صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔دوسرا 10 صفحات پر سمہ حکمرانوں کے بارے میں ہے ۔تیسرے باب میں

30 صفحات کے اندر ارغوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ چوتھا باب جو 176 صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کا خاص قابل توجہ حصہ ہے۔ مصنف کا اصل مقصد تر خان کے حالا ت لکھنا ہی تھا اور پہلے ابواب صرف اسکی تمہید کے لئے تھے۔

تاریخ طاہری کے بعد ایک اور تاریخ جو اس زمانہ میں لکھی گئی اور سندھ کی مخصوص تاریخ ہے، بیگلا رنامہ ہے، تاریخ کا نام شاہ قاسم خان بن امیر سید قاسم بیگلا رکے نام پر رکھا گیا۔ بیگلا رخاندان تبریز سے سمرقند آیا اور وہاں سے شاہ حسین ارغون کے زمانے میں سندھ میں آیا۔ شاہ قاسم خان نے سندھ آ کر عمر کوٹ کے رانا کے خاندان میں شادی کی۔ اس کتاب میں اس شخص کے کارناموں کو خان زمان کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ ایلیٹ صاحب کے خیال میں یہ کتاب 1017ء سے لیکر 1066ء تک کسی وقت بھی لکھی گئی، مگر سورلے صاحب نے اس تاریخ کا سن اختتام 1028ع متعین کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے کتاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اس کا مخصوص کام تر خان خاندان کے متعلق معمولی معمولی باتیں بھی کتاب میں درج کرنا ہے۔

دیباچے کے بعد سندھ کے تمام حالات اور عربوں کے جملہ پر ۲۲ صفحات لکھے ہیں، اس کے بعد 18 صفحات پر ارغوں کے حالات ہیں، پھر 27 5 صفحات کی کتاب میں باقی تمام حالات تر خان گھرانے کے ہیں جس میں اندرونی جھگڑے اور معمولی معمولی واقعات بھی شامل ہیں۔

تر خان نامہ یا ارغون نامہ سندم 1065ع کی تصنیف ہے۔ اس کا مصنف سید جمال بن میر جلال الدین حسین شیرازی ہے۔ یہ تاریخ مرزا محمد صالح تر خان کے نام پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے بیشتر حصے میر معصوم کی تاریخ سندھ سے لئے گئے ہیں اور اکثر انہی واقعات کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے۔ کتاب کی تقسیم اس طرح سے ہے۔

3 صفحات میں دیباچہ، پھر نوح علیہ السلام سے لیکر محمد صالح تک شجرہ جو 28 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسکے بعد 40 صفحات میں ترکستان کے خانوں اور چنگیز خان کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ارغوں کے حالات 22 صفحات میں اور تر خان خاندان کے 33 صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ تاریخ کل 127 صفحات پر ہے۔ طرز شگفتہ اور دلکش ہے مگر جس قدر اچھے حصے ہیں وہ سب مستعار دوسری کتابوں خصوصاً تاریخ معصومی سے مستعار لئے گئے ہیں۔

سندھ کے مقامی مورخین کی تاریخوں میں تحفتہ الکرام سب سے زیادہ ضخیم تاریخ ہے۔ اس کا مصنف میر علی شیر قانع ٹھٹھوی ہے۔ ڈاکٹر سورلے کا خیال ہے کہ یہ کتاب غالباً 1773ء میں پوری ہوئی۔ یہ تاریخ تین جلدوں میں ہے۔ پہلے دو حصے نہایت ضخامت رکھتے ہیں، مگر وہ عام تاریخ پر مبنی ہیں۔ تیسرا حصہ صرف سندھ کے لئے مخصوص ہے۔ یہ حصہ

کافی دلچسپ ہے۔اس میں تاریخ سندھ کے ساتھ ساتھ سندھ کے شہروں اور دیہات اور خاص خاص سر برآوردہ لوگوں کے حالات درج ہیں۔اسکے ساتھ ساتھ عالموں، فاضلوں اور ممتاز لوگوں کی یادداشتیں بھی ہیں اور سندھ کے ابتدائی حالات بھی ہیں۔رائے خاندان، محمد بن قاسم کا سندھ میں ورود اور پھر سندھ کے مختلف باجگذار اور مطلق العنان حاکموں کے ذکر ہیں۔میر علی شیر قانع نے قدیم کتب تاریخ سے نقل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ معلومات میں ایسا تنوع ہے جو پڑھنے والوں کو دوسری جگہ نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ ان قصوں کو بھی کتاب میں درج کر دیا ہے جو روایتی طور پر پشتہا پشت سے چلے آرہے ہیں۔اسکے علاوہ مختلف قبائل کے اصل اور ممتاز لوگوں کی جدا جدا سوانح عمریاں بھی دی گئی ہیں۔کتاب کی ابتدا رائے اور برہمن خاندان سے ہوتی ہے۔اسکے بعد محمد بن قاسم کے ورود سندھ کا ذکر ہے۔یہ سب چچ نامہ سے لیا گیا ہے۔ اگلے تیس صفحات میں شاہاں دہلی کی طرف سے سندھ میں متعین شدہ حاکموں کا ذکر ہے اور اسکے علاوہ سومروں اور سمموں کے حالات بھی اسکے ساتھ دیئے گئے ہیں۔پھر 36 صفحات میں ارغوں اور ترخان حکمرانوں کے واقعات ہیں۔اسکے بعد تیموری گورنروں اور کلہوڑوں کے حالات ہیں یہ سب کتاب کے نصف حصے کو محیط کئے ہوئے ہے۔

باقی نصف حصے میں فقیروں، صاحب حال درویش، ارباب صوفیہ، اولیا اور سادات، خوشنویس، کاتب اور شاعروں کا ذکر ہے۔اس طرح سندھ کی کتب تواریخ میں سب سے زیادہ مواد تحفتہ الکرام میں ملتا ہے۔اس میں ان تمام مصنفین کے حوالے موجود ہیں جن کا ذکر پچھلے صفحات پر آیا ہے، لیکن تاریخی مواد کو ناقابل اعتبار روایات سے گڈ مڈ کر دیا ہے۔

سندھ کی تاریخ پر انگریزی میں بھی کافی ذخیرہ جمع ہوگیا۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے پہلے 1226ء میں تجارت کا بہانہ کر کے سندھ پر توجہ کی اور یہاں ایک فیکٹری قائم کی جسکی میعاد 1636ء سے 1662ء تک تھی۔اسکے ساتھ ساتھ

ہی یورپی سیاحوں نے سندھ کو کھنگالا اور اپنے سیاحت ناموں میں سندھ کے حالات لکھے۔اور اس وقت تاریخ لکھی اور سٹین نے کلہوڑوں کی (سنہ 1802ء) اور ھیوز نے 1874 میں سندھ کا گزیٹر لکھی، برٹن نے دو کتابیں اور بھی سندھ کے بارے میں لکھیں:۔

ا)سندھ ایک ناخوشگوار وادی ۱۸۵۱ء

(2)سندھ اور وہ قومیں جو یہاں رہتی ہیں۔۱۸۵۱ء

اسکے علاوہ بہت سے سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں سندھ کے بارے میں لکھا ہے۔علاوہ ازیں انگریزوں نے سندھ کی تہذیب پر بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جن میں سندھ کی تہذیب (1935) مارشل کی موئن جوڈرو اور سندھی تہذیب (1931) راورٹی کی سندھ کا میدان اور اس کی شاخیں (1892) مشہور ہیں۔

سندھ کے آثار قدیمہ پر بھی انگریزی میں کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں کزنس کی ''سندھ کے آثار قدیمہ'' (۱۹۲۵) اور ھیگ کی Indus Delte.....(1892) کافی عمدہ اور اچھی کتابیں ہیں۔

اسکے علاوہ سندھ کے گزیٹئر بھی ہیں جن میں امپیریل گزیٹر 1908ء اور اٹکینس کا گزیٹئر 1907 بھی قابل ذکر ہیں۔

اردو میں بھی سندھ کی تاریخ پر قابل ذکر ذخیرہ جمع ہوا ہے۔ان کتابوں میں سے پہلے عبدالحلیم شرر نے تاریخ سندھ لکھی اسکے بعد معارف اعظم گڑھ سے ابوظفر صاحب ندوی نے 1947ء میں اردو میں تاریخ سندھی شایع کی۔یہ کتابیں تاریخی حیثیت سے کافی دلچسپ اور پر از معلومات ہے۔اس کے علاوہ چچ نامے کا اردو میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ پہلا اردو ترجمہ محمد حفیظ الرحمن صاحب حفیظ نے نے کیا اور بہاولپور سے ۱۹۳۷ میں شایع ہوا مگر یہ ترجمہ انگریزی تاریخ سے کیا گیا ہے، اور صحت کے لحاظ سے ناقص ہے اس کے بعد اہم اور مفصل تاریخ سندھ ہمیں پر کتاب ملتی ہے وہ ہے مولونا اعجاز الحق قدوسی کی تین جلدوں میں تاریخ سندھ، یہ کتاب معتبر اور مستند کہی جاسکتی ہے۔چنانچہ اب بھی تاریخ سندھ پر اور اردو، انگریزی اور سندھی زبانوں میں کام جاری وساری ہے۔

* * *

نور شاہ جہان انور کے پشتو نثری آثار میں فارسی اشعار کے حوالے

* ڈاکٹر اصل مرجان محب وزیر

References to Persian Poems in Pashto Prose Works of Noor Shah Jahan Anwar

Dr. Asal Marjan Wazeer

Noor Shah Jahan Anwar was born on 20 November 1933 in Karak District of Khyber Pakhtunkhwa. His Father name Mulana Shaikh Hassan. He belongs to a religuies family, therfore his inclination towards persion was natural. Firstly he was became a teacher of Persion language and literature, and later appointed as a lecturer in Pashto. He deeply studied and analyzed the Persion classical poetry. His pashto writing were deeply influenced by the Persion language, especially by the Persion classical poetry. In this article presented a study that how much and how influuenced his Pashto prose writings by the
Persioan classical poests.

Key Words: Persion, Pashto, Classical, Masnavee, Inflence, Style, Prose

نور شاہ جہان انور خیبر پختونخوا کے جنوبی ضلع کرک کے تخت نصرتی تحصیل کے گنڈیری گاؤں میں مولانا شیخ حسن کے گھر ۲۰ نومبر ۱۹۳۳ کو پیدا ہوئے۔ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق کی بناء پر فارسی زبان سے گہرا تعلق رہا۔ اُنہوں

* پختونخوا اسڈی سنٹر، باچا خان یونیورسٹی چارسدہ۔

نے پشاور یونیورسٹی سے ایل اے فارسی کا امتحان نمایاں پوزیشن کے ساتھ پاس کیا اور گولڈ مڈل کے حقدار ٹھہرے۔ فارسی میں امتحان پاس کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد فارسی ادبیات کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ بعد میں اُن کی تقرری پشتو ادبیات کے استاد کے طور پر کیا گیا(۱) اور یوں اُن کا رشتہ پشتو ادبیات کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ لیکن فارسی ادب سے تعلق اور رشتہ آخر وقت تک برقرار رہا۔

نور شاہ جہان انور کا تعلق پشتو ادب کے اُس نسل سے رہا ہے جو شعوری طور پر پشتو ادبیات کو علمی زیور سے آراستہ کرنے نکلے تھے، پشتو زبان و ادب کو دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے توسط سے پروان چڑھانا چاہ رہے تھے۔ انور صاحب کا نثری اسلوب انتہائی سادہ اور بامحاورہ ہے۔ نثر میں اشعار کے استعمال کے ہنر پر کافی دسترس رکھتے تھے۔ اُنہوں نے پشتو میں تنقید، تبصرہ، مقدمہ، ترجمہ کے میدان میں کافی کام کیا ہے۔ اُن کے تمام تر تحاریر پر فارسی ادب کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم اُن کے نثری آثار میں فارسی شعراء کے اشعار کا مطالعہ پیش کریں گے۔

د عقیدت گلونہ (عقیدت کے پھول) کے عنوان سے اُن کا ایک مضمون ''جمہورِ اسلام'' (۲) میں شائع ہوگیا ہے، جو کہ مختلف زبانوں میں نعت گوئی کے حوالے سے معلومات رکھتے ہیں۔ اس مضمون میں جہاں عربی، بنگالی اور دیگر زبانوں کے نمونے پائے جاتے ہیں، وہاں فارسی کے جید شعراء کے نمونے بھی رکھے گئے ہیں۔ اس مضمون میں زبانوں یا شعر و ادب کی اپنی مٹی یا اپنی ثقافت کے ساتھ مضبوط رشتے کے تناظر میں مولانا روم کے ایک شعر کا یوں حوالہ دیتا ہے:

هندوان را اصطلاح هند مدح سندیان را اصطلاح سند مدح(۳)

ہندو یا ہندستانی اپنی شکل و صورت کی تعریفیں کرتے ہیں اور سندھ کے رہنے والے اپنی مٹھاس کو بیان کرتے رہتے ہیں۔ یہاں نور شاہ جہان انور نے دو مختصر مصرعوں میں کتنی گہری اور طویل بیان کو سمیٹا ہے۔ اسی مضمون میں شیخ سعدی کے دو نعتیہ اشعار کا حوالہ بھی دیتا ہے:

نگین ختم رسالت پیغمبر عربی شفیع روزِ قیامت محمد مختار

اگر نه واسطه موی و روی او بودی خدای خلق نه گفتی قسم به لیل و نهار(۴)

انور نے سعدی کے نعتیہ اشعار میں کمال انتخاب کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہوں نے فارسی ادب اور خصوصاً سعدی کو انتہائی باریک اور نزدیک سے پڑھا اور سمجھا ہے۔ ان اشعار میں سعدی پیغمبرِ اسلام کی تعریف میں

رومانوی فضا تخلیق کرتا ہے، جو اُن ہی کی شایانِ شان ہے۔

اس مضمون میں آگے وہ علامہ اقبال کے چند نعتیہ اشعار بھی پیش کرتے ہیں:

ای ظھورِ تو شبابِ زندگی جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
ای زمین از بارگاھت ارجمند آسمان از بوسہ بامت بلند
شش جھان روش زتاب روئی تو ترک و تاجک و عرب ھندوئی تو(۵)

پیغمبرِ اسلام کو زندگی کا شباب، جلوہ اور خواب کے طور پر پیش کرتے ہیں ِ زمیں و آسماں کا شان و شوکت اُسی سے منسوب کرتے ہیں، ترک و تاجک و عرب و ہند کو آپ ﷺ کے نور سے پہچان اور شناخت مل جاتا ہے۔ اتنی بامعنی اور باذوق اشعار سے پشتو تحاریر کو با اثر بنانے کا ہنر اور سلیقہ نور شاہ جہان کے برخے میں ہی آسکتا ہے۔

دمولانا روم او علامہ اقبال نظریۂ عشق (مولانا روم اور علامہ اقبال نظریۂ عشق) کے عنوان سے نور شاہ جہان انور کا ایک اور مضمون ماہنامہ ''پشتو'' (۶) میں شائع ہوگیا ہے۔ جس میں اُنہوں نے مشرقی ادبیات کے ان دونوں اکابرین کا نظریۂ عشق کو پشتو پڑھنے والوں کے سامنے خوب پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں جہاں انہوں نے پشتون قاری کو ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں ان دونوں نابغہ وں کو بھی ایک ایسے انداز میں پیش کیا ہے، جس کی وجہ سے ہم انور صاحب کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ عشق کے حوالے سے مولانا روم کا ایک شعر نقل کرتا ہے:

شاد باد ای عشق خوش سودای ما ای طبیبِ جملہ علت ھای ما(۷)

اس شعر میں مولانا روم کا نظریۂ عشق واقعی انداز میں نمایاں کیا جاسکتا ہے، وہ عشق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے، کہ تو میرے ذہن و دماغ پر ایک نایاب اور خوبصورت فکر کی طرح چھا گئے ہو، تو خوش و خرم رہے، تو نے ہی میرے تمام علتوں (بیمار ذہنیت) کا علاج کر ڈالا ہے۔ ایسے نمونوں کے نقل کرنے سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انور صاحب کو بھی اپنے موضوع پر مکمل گرفت رہتا ہے۔ اس لئے تو وہ انتخاب میں ہی کمال کر دیتا ہے۔ اسی مضمون میں مولانا روم ایک اور ایسا شعر پیش کرتا ہے، جس میں عشق اور عقل کا موازنہ کیا گیا ہے:

عاشق از حق چون غذا یابد رحیق عقل انجا گم شود گم ای رفیق(۸)

عشق روح کیلئے غذا یا ایک ایسے دوست جو ہمیشہ ساتھ ہو، کی حیثیت رکھتا ہے، جبکہ عقل کی حیثیت اُس دوست کی سی ہے جو تکلیف اور مصیبت کے وقت پر غائب ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں عشق اور عقل کا اس سے آسان

اور معقول تشریح اور تقابل کہیں نہیں ہوسکتی ہے۔اور نور شاہ جہان انور کی یہ خوبی ہے کہ حوالہ جات کے طور پر ہمیشہ ہی ایسے مواد کو اُٹھاتے ہیں، جو انتہائی متعلقات کے حامل ہو۔وہ بلاوجہ قاری کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا ہے۔اسی مضمون میں علامہ اقبال کے بھی چند اشعار کو نقل کرتے ہیں، جس سے اُن کو تو علامہ اقبال کا نظریہ عشق کو اجاگر کرنا مقصود ہے، مگر یہاں ہمیں انور صاحب کا فارسی اشعار کو برتنے کا انداز سامنے لانا مقصود ہے:

عقل در پیچاک اسباب و علل　　عشق چوگان باز میدان عمل
عقل را سرمایه از بیم و شک است　　عشق راعزم و یقین لاینفک است(۹)

عقل کا سرمایہ خطرات، شکوک اور گماں ہوتے ہیں، جبکہ عشق کا مل یقین اور پختہ عزم اور ارادوں سے سروکار رکھتا ہے، جو کبھی بھی عشق سے الگ تصور نہیں کئے جاسکتے ہیں۔کسی کا اصل مدعا بیان کرنے کا دوٹوک اور واضح اندازِ بیان کو سامنے لانے میں مہارت اسی کا نام ہوتا ہے، کہ مصنف کن اشعار یا اقتباسات کا انتخاب کرتا ہے، اور نور شای جہان کو یہ کمال بدرجہ اتم حاصل رہا ہے۔

نور شاہ جہان انور نے ''دخوشحال خٹک قطعات اومتفرقات''(۱۰) کے نام سے ایک طویل مضمون لکھا ہے جو خوشحال خان خٹک کے دیوان میں بطور مقدمہ شامل ہے۔جس میں خوشحال خان خٹک کے قطعات اور متفرقات کا فنی اور فکری جائزہ لینا مقصود ہے۔اس مضمون میں بھی اُنہوں نے تقابلی انداز میں فارسی شعراء کے اشعار کو بروئے کار لائے ہیں۔اس مضمون میں ایک جگہ وہ خوشحال خٹک کے محبوب پر وارفتگی کا جب اظہار کرتے ہیں تو وہ حافظ شیرازی کا یہ شعر بھی پیش کر دیتے ہیں، جس سے خوشحال خٹک کے اصل ماخذ کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے:

اگر آن ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا　　به خالِ هندویش بخشم سمرقند د بخارا را(۱۱)

اس شعر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خوشحال خان خٹک اگر محبوب کے خال پر بہت کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہے، تو حافظ صاحب بھی شیراز کے محبوب پر سمرقند و بخارا تک قربان کرنے کی پیشکش کر چکے ہیں۔اسی مقدمہ میں عشق کی ابدیت کے تناظر میں ایک جگہ وہ خوشحال خٹک کا ذکر کرنے لگا ہے۔اسی حوالے سے اُنہوں نے رحمان بابا، مصری خان اور دیگر پشتون کلاسیکی شعراء کے حوالے بھی دے چکے ہیں، لیکن وہ فارسی شعراء کو بھی نہیں بھولے ہیں۔حافظ شیرازی ہی کا ایک شعر نقل کرتے ہیں:

نه بود نقش دو عالم که رنگ الفت بود　　زمانه طرح محبت نه این زمان انداخت(۱۲)

''درحمان بابا یوشعر''(۱۳) کے نام سے ایک اور مضمون جو پشتو اکیڈمی کے مجلے ''پشتو'' میں شائع ہو چکا ہے، میں وہ رحمان بابا کی شعری عظمت کو اجاگر کر رہے ہیں۔اس مضمون میں جہاں اور مذکور فارسی شعراء کے اشعار کو منقول کیا گیا ہے، وہاں برصغیر پاک و ہند کے فارسی گو شاعر امیر خسرو کا یہ شعر بھی لایا گیا ہے:

هر دو عالم قیمت خود گفته وی نرخ بالا کن که ارزانی هنوز(۱۴)

اس شعر کا بھی رحمان بابا کے اشعار کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے، جس میں وہ اپنے محبوب (رب) کے ارزانی کا واویلا کرتے ہیں۔محبوب پر دونوں جہانوں کو قربان کرنا بھی ان شعراء کے خیال میں ارزانی ہے۔اسی مضمون میں رحمان بابا کی شاعری میں ہجر و وصل کا تذکرہ کرتے ہوئے انور صاحب مرزا اسداللہ خان غالب کے ایک فارسی شعر کا صرف ایک مصرعہ نقل کرتے ہیں۔گویا وہ صرف ایک ہی مصرعے میں اپنا پورا مدعا پیش کر دیتا ہے، یہاں شعر کو مکمل نقل کرنے کی جسارت کرتا ہوں:

وداع و وصل جداگانه لذتی دارد هزار بار برو صد هزار بار بیا(۱۵)

کیا انتخاب شعر ہے، جس سے ایک طرف اگر رحمان بابا کی شعری عظمت کو سامنے لایا گیا ہے، تو دوسری جانب ہجر و وصل کے تماشوں کو کتنا دلکش اور دلعزیز پیش کیا گیا ہے۔ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مضامین کے تناظر میں اشعار کا یہ انتخاب بتاتا ہے، کہ فارسی شاعری پر نور شاہ جہان انور کو کتنا عبور حاصل تھا۔

''مولانا محمد جلال الدین محمد رومی''(۱۶) کے نام سے انور صاحب نے مولانا روم کے حوالے سے ایک تعارفی مضمون تحریر کیا ہے۔جس میں مثنوی کا خصوصی تذکرہ موجود ہے۔انور صاحب نے مثنوی کی ناقدانہ تجزیے کے لئے فارسی شعراء کے ایسے اشعار نقل کئے ہیں، جس میں مولانا روم اور مثنوی کی حقیقی روح کو اجاگر کیا گیا ہے۔انہوں نے مولانا عبدالرحمان جامی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ اشعار نقل کئے ہیں:

من نمی گویم که آن عالیجناب هست پیغمبر ولی دارد کتاب
مثنوی و معنوی و مولوی هست قرآن در زبان پهلوی(۱۷)

ان اشعار میں، پیغمبر اگرچہ نہیں ہے، مگر کتاب رکھتا ہے یا پہلوی زبان میں قرآن کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسے شاندار خراج مثنوی کو پیش کیا گیا ہے۔اسی مضمون میں انور صاحب شاہ قاسم انور کا ایک شعر جو کہ مثنوی کے حوالے سے کہا گیا ہے، کو نقل کرتے ہیں:

جان معنی قاسم از خواهی بخوان مثنوی معنوی مولوی(۱۸)

روح کی حقیقت کو سمجھنے اور جاننے کے لئے مثنوی کو پڑھنا اور سمجھنا ہی تجویز کیا گیا ہے۔اس سے بڑھکر کسی فنپارے کی عظمت کو کیسے بیان کیا جاسکتا ہے۔

نورشاہ جہان انور کے نثری آثار میں فارسی اشعار کے ایسیسینکڑوں حوالے نقل کئے جاسکتے ہیں اور اس پر تبصرہ اور تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔کیونکہ فارسی ادبیات اُن کا اوڑنا بچھونا رہا ہے۔فارسی سے اُن کو انتہا کی حد تک محبت وشغف و رغبت رہی ہے۔لیکن یہاں ہم نے اُن کے اس پہلو کی جانب چند اشارے ہی مقصود تھے۔اخر میں، میں نورشاہ جہان صاحب کے اس پہلو پر باقاعدہ تحقیق کرنے کی تجویز ضرور دے سکتا ہوں، کہ اس موضوع پر کم ازکم ایم فل کی سطح کی تحقیق یقینی طور پر کی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خٹک، بنارس خان، ڈاکٹر، مقدمہ، مشمولہ: دنورشاہ جہان انور نثری آثار، مرتب: ڈاکٹر بنارس خان خٹک، پشاور، اعراف پرنٹرز، ۲۰۲۲ء، ص ص ۲۶: ۔۔ ۲۸

۲۔انور، نورشاہ جہان، دعقیدت گلونہ، مشمولہ جمہورِاسلام، جولائی ۱۹۶۵ء، ص ۱۵:

۳۔ مولوی رومی، جلال الدین بلخی، مثنوی معنوی، بسعی واہتمام رینولدالین نکلسون، چاپخانہ محمد علی علمی، ۱۹۳۳ء، ص ۲۸۲:

۴۔ سعدی شیرازی، مصلح الدین، کلیاتِ سعدی، بہ تصحیح محمد علی فروغی، ص ۱۰۸۲: ء

۵۔ اقبال لاہوری، محمد اقبال، کلیاتِ اقبال لاہوری (فارسی)، بہ کوشش: فرید مرادی، موسسہ انتشارات نگاہ، تہران، چاپ اول ۱۳۸۸ھ، ص ۹۰:

۶۔ انور، نورشاہ جہان، دمولانا روم اوعلامہ اقبال نظریہ عشق مشمولہ: میاشتنئ مجلہ، پشتو، پشتو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور، ستمبر ۱۹۸۱ء، ص ۴۷ :

۷۔ مولانا روم، مثنوی معنوی، ص ۲۷۲:

۸۔ مولانا روم، مثنوی معنوی، ص ۴۳۶:

۹۔ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، مرتبہ: ڈاکٹر جاوید اقبال، ص ۲۷۸:

۱۰۔ انور، نورشاہ جہان، دخوشحال خٹک قطعات اومتفرقات (مقدمہ)، دیوانِ خوشحال خان خٹک (دویمہ حصہ)، پشاور، پشتو اکیڈمی، یونیورسٹی آف پشاور، س ن

۱۱۔ حافظ شیرازی، محمد، خواجہ شمس الدین، دیوانِ خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی، باہتمام: محمد قزوینی ودکتور قاسم غنی، وزارت فرہنگ و

ارشاد اسلامی، طہران، طبع اول، ۱۳۸۷، ص ۳:
۱۲۔ دیوانِ خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی، ص ۱۳:
۱۳۔ انور، نور شاہ جہان، د رحمان بابا یو شعر، مشمولہ میاشتنیٔ پشتو، پشاور، پشتو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور، ستمبر ۱۹۹۶، ص ۲۲:
۱۴۔ امیر خسرو، دیوانِ امیر خسرو دہلوی، ترتیب و تہذیب ڈاکٹر انوار الحسن لکھنو، راجہ کمار بیگ ڈپو، ۱۹۶۷ء، ص ۵۵۷:
۱۵۔ غالب، مرزا اسد اللہ خان، دیوانِ غالب دہلوی، (مشتمل بر غزلیات و رباعیات فارسی)، مقدمہ تصحیح و تحقیق محمد حسن حائری، تہران، مرکز میراث مکتوب با ہمکار انستیتوتِ غالب، طبع دوم ۱۳۸۶، ص ۱۱۰:
۱۶۔ انور، نور شاہ جہان، مولانا محمد جلال الدین محمد رومی، مشمولہ د نور شاہ جہان انور نثری آثار، ص ۷ ۵۳:
۱۷۔ گوپاموی، قدرت اللہ، محمد، تذکرہ نتائج الافکار، بمبئی، چاپخانہ سلطانی نمبر ۳، پندرواں ایڈیشن، ۱۳۳۶ھ، ص ۱۴۲:
۱۸۔ قاسم انور، کلیاتِ قاسم انور، با تصحیح و مقابلہ و مقدمہ سعید نفیسی، انتشارات کتابخانہ سنائی، تہران، ۱۳۳۷، ص ۳۲۰:

***

علامہ اقبال، سکھ اور سکھ مذہب

*ڈاکٹر زیب النساء سرویا

Allama Iqbal, Sikhs and Sikh religion

Zaib un Nisa Sarwiya

Sikhism is an Indian religion that is originated in the region of subcontinent around the end of 15th century c e. It is also known as Sikh or Sikh dharma. This religion developed from the spiritual teachings of Guru Nanak(first guru(and the nine Sikh gurus who succeeded it. Sikhism is a monotheistic religion with Pantheistic elements. Sikhs believe in one god, divine unity, equality and freedom of religion, and community service and justice for all. Dr Allama Muhammad Iqbal, the poet of East, spent his life in a multi-religion society. Like other religions, he studied this religion in depth. He gave a short true picture of Guru Nanak's life and his teachings in his poetry. He appreciated positive teachings of Guru Nanak and criticized negative attitude of Sikhs. This article presents a true picture of Guru Nanak's character, some teachings of this religion and Sikh's attitude in Iqbal's poetry.

سکھ مت ایک ہندوستانی مذہب ہے جس کی ابتدا 15 ویں صدی عیسوی کے آخر میں برصغیر کے علاقے میں ہوئی تھی۔ اسے سکھی یا سکھ دھرم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ مذہب گرو نانک کی روحانی تعلیمات سے تیار ہوا، پہلے گرو نانک اور ان کے بعد آنے والے نو سکھ گرو۔ سکھ ایک خدا، الٰہی اتحاد، مساوات اور مذہب کی آزادی، کمیونٹی

سروس اور سب کے لیے انصاف پر یقین رکھتے ہیں۔شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے کثیر المذاہب معاشرے میں زندگی گزاری، دیگر مذاہب کی طرح انھوں نے اس مذہب کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ انھوں نے اپنے کلام میں گرو نانک کی زندگی اور تعلیمات کی ایک مختصر سچی تصویر پیش کی، مثبت تعلیمات کو سراہا اور سکھوں کے منفی رویے پر تنقید کی۔ یہ مضمون کلامِ اقبال میں گرو نانک کے کردار، مذہبی تعلیمات اور سکھوں کے رویے کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔

اہلِ دانش نے پنجاب کی سرزمین کو مذاہب و نظریات کی دھرتی قرار دیا جو فی نفسہ بڑی سچائی ہے۔مثلاً ہندو مذہب کی مقدس ترین کتاب ''رگ وید'' اسی دھرتی پر قلم بند ہوئی۔کوروؤں اور پانڈوں کی فیصلہ کن جنگ اسی سرزمین پر لڑی گئی۔ پنجاب ہی کے ضلع چکوال میں کٹاس کے مندر ہیں(۱)۔ناتھ جوگیوں اور تانترک فلسفے کے بیشتر پیروکاروں کا مسکن بھی یہی علاقہ تھا۔اِسی سرزمین پر سکھ مذہب نے جنم لیا۔

سکھ کے لغوی معنی سیکھنے والا، سکشا تعلیم پانے والا، نصیحت پذیر، شاگرد رشید، چیلا اور بالکا کے ہیں۔(۲)

سکھ مذہب کی انگریزی لغت میں سکھ مذہب کے متعلق لکھا ہے:

"A sikh as,any person who believes in God;in the ten Gurus;in the Guru Granth Sahib and other writing of the Gurus,and their teaching;in the Khalsa initiation cermony;and who does not believe in the doctrinal system of any other religion.(3)

ترجمہ :(ایک سکھ ایک خدا پر، دس گروؤں، گرو گرنتھ صاحب، گروؤں کی دیگر تحریروں، تعلیمات اور خالصہ میں داخلہ کی ابتدائی مذہبی رسم پر یقین رکھتا ہے۔اپنے مذہب کے علاوہ وہ کسی دوسرے مذہب کے تعلیمی و تربیتی نظام پر یقین نہیں رکھتا۔)

پندرھویں صدی میں گورو نانک دیو جی کے پیروکار اس کے نام سے موسوم ہوئے۔(۴) اس مذہب کے متعلق دو نظریے ہیں۔بعض کے نزدیک یہ جدید اور خود مختار مذہب ہے اور مذاہبِ عالم میں اسے مستقل مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔بعض کے نزدیک یہ کوئی باقاعدہ مذہب نہیں بلکہ ہندو مذہب کی ایک اصلاحی تحریک کا نام ہے جس نے ہندوانہ عقائد اور نظریات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔(۵) سکھ اسے تسلیم نہیں کرتے۔اُن کا کہنا ہے کہ سکھ مذہب تبلیغی ہے جب کہ ہندو مذہب میں تبلیغ کی مخالفت ہے، شیر سنگھ لکھتے ہیں:

"Hinduism has never been a missionary.....religion.....so a Hindu could not go out to

preach his mission in the lands of Muslims where he hold to eat their food and drink their water which practice is so strictly forbidden by the shastras."(6)

ترجمہ :(ہندومت کبھی بھی تبلیغی مذہب نہیں رہا۔اس لیے کہ ہندو کبھی بھی اپنے عقیدہ کی تبلیغ کے لیے مسلم علاقوں میں نہ گئے کہ وہاں اُنھیں مسلمانوں کے ساتھ کھانا پینا پڑتا جب کہ ہندومت شاستروں میں میل جول اور طعام وشراب کی ممانعت ہے۔)

گویا سکھ اپنے مذہب کو خود مختار تسلیم کرتے ہیں۔اُن کے نزدیک ان کے مذہب کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

بقول نانک سنگھ نشتر:

"سکھ کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔وہ انسانیت میں ایقان رکھنے والا بین المذہبی،سبحان اللہ کا آزاد بندہ(واہگر وکا خالصہ) ہے۔اس لیے سکھ کبھی مذہبی متعصّب ہو ہی نہیں سکتا۔"(۷)

مذکورہ بالا معلومات سے ہم درج ذیل نکات اخذ کرتے ہیں:

1۔سکھ مذہب کا آغاز برصغیر پاک وہند میں ہوا۔

2۔گرونانک اس مذہب کے بانی اور پہلے گرو ہیں۔

3۔یہ دس گروؤں اور گروگرنتھ پر یقین رکھتے ہیں۔

4۔یہ توحیدی مذہب ہے۔

5۔ہندو مذہب کے برعکس یہ مذہب تبلیغ پر یقین رکھتا ہے۔

اقبال اور سکھ:

اقبال کثیر المذاہبی معاشرے کے فرد تھے۔اُنھیں بچپن ہی سے کئی مذاہب کے اساتذہ سے علم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ان میں سکھ اساتذہ بھی تھے۔ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے تقی شاہ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ اقبال عربی اور فارسی پڑھنے کے بعد ماسٹر سندر سنگھ سے کئی ماہ ریاضی پڑھنے باقاعدگی سے جاتے رہے۔(۸) 1891ء میں سکاچ مشن سکول کے ہیڈ ماسٹر نرنگھ داس آٹھویں جماعت کو اُردو سے انگریزی ترجمہ کی مشق کراتے رہے۔اقبال اِن کے بھی شاگرد رہے۔(۹)اسی سکول کے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ہرنام سنگھ اقبال کے ریاضی اور جغرافیہ کے اُستاد رہے۔(۱۰)1893ء میں سندر داس اقبال کے اُردو،انگریزی اور جغرافیہ کے اُستاد رہے۔(۱۱)لالہ نرنجن داس

نے اسکاچ مشن کالج میں اقبال کو ریاضی پڑھائی۔(۱۲) اُن کو اِن سکھ اساتذہ کی صحبت بھی میسّر رہی۔

اقبال کے ندیموں اور جلیسوں میں بھی کئی سیاسی وغیر سیاسی سکھ شخصیات شامل تھیں۔متحدہ ہندوستان کی مشہور اور نامور شخصیت سر سندر سنگھ سے اقبال کے دیرینہ اور دوستانہ مراسم تھے۔(۱۳) سردار جگند رسنگھ اقبال کے پرانے مخلص اور عزیز دوست تھے۔اُنھوں نے مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان مفاہمت کا آغاز کیا تھا۔اقبال نے دوستی ہونے کے باوجود صوبے کی کونسل میں مسلم نشستوں کے حصول کے لیے اِن سے دوٹوک الفاظ میں بات چیت کی تھی۔(۱۴) سردار امراؤ سنگھ مجیٹھیا بھی اقبال کے جلیس اور دوست تھے۔اچی سن کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔وہ سنسکرت، فارسی اور انگریزی کے عالم اور مشہور شاعر تھے۔علامہ اقبال ان سے نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کے گھر ملے۔جب اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو پیرس ریلوے اسٹیشن پر امراؤ سنگھ نے ان کا استقبال کیا۔تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جاتے ہوئے پیرس میں قیام کے لیے ٹھہرے تو بھی ریلوے اسٹیشن پر امراؤ سنگھ ہی نے ان کا استقبال کیا تھا۔(۱۵) دونوں میں بہت بے تکلفی اور یاری تھی۔(۱۶) علامہ اقبال کی ذاتی کتب میں تین کتب ایسی ہیں جن میں سے دو امراؤ سنگھ مجیٹھیا کی ذاتی لائبریری کی ہیں اور ایک اُنھوں نے اقبال کو پیرس سے ارسال کی تھی۔(۱۷) امراؤ سنگھ مجیٹھیا جب اقبال سے ملاقات کے لیے آتے تو ان کے ساتھ کئی دیگر احباب بھی ملاقات کرنے آیا کرتے تھے۔1926ء میں ان کی آسٹرین بیوی کا بھائی مسٹر مارٹن اور سردار امراؤ سنگھ کی دوخورد سال صاحبزادیاں امرتا شیر گل اور اندو اقبال سے ملاقات کرنے آئی تھیں۔(۱۸) اقبال بھی ان سے ملاقات کرنے ان کی رہائش گاہ پر جایا کرتے تھے۔(۱۹) اقبال امراؤ سنگھ کے مخلصانہ جذبات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اپنے دوستوں سے خط کتابت میں امراؤ سنگھ کا ذکر کیا کرتے تھے۔وہ امراؤ سنگھ کے علمی اور ادبی مقام کے معترف تھے۔امراؤ سنگھ نے اقبال کی شاعری اور فلسفے پر مضامین لکھے اور کئی نظموں کا انگریزی زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔اقبال ان کے کیے ہوئے تراجم سے مطمئن تھے۔(۲۰) سردار جگند رسنگھ جوگی سے اقبال کے مراسم تھے۔(۲۱) مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی بمپا دلیپ سنگھ بھی اقبال کے ملاقاتیوں میں شامل تھی۔ایک مرتبہ اقبال سردار جگند رسنگھ کے ساتھ بمپا کی کوٹھی پر بھی گئے جہاں درختوں کے جھنڈ میں بمپا دلیپ سنگھ کے ساتھ چائے پی۔بمپا نے اقبال سے نظم بھی سُنی۔جس کا مفہوم اور تشریح سردار جگند رسنگھ سمجھاتے رہے۔بمپا نے ڈرائیور سے حقہ دم کروا کر اپنے ہاتھ سے اقبال کو پیش کیا جس پر اُنھوں نے مسرّت کا اظہار کیا۔ایک مرتبہ پھر دلیپ سنگھ نے اقبال کو چائے پر مدعو کیا۔اس ملاقات میں سر جگند رسنگھ موجود نہ

تھے۔ بمپا کی ایک آسٹریلین سہیلی اور ایک یورپین خاتون بھی مدعو تھی۔ اُس نے اقبال کو پھول پیش کیا۔(۲۲) ایسے ہی بیرسٹروی۔ ڈی سنگھا بھی اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔(۲۳)

اقبال کے معالجین میں ایک سکھ ڈاکٹر بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ خاندانی معالج تھے۔ گھر میں چھوٹی بڑی طبی امداد کے لیے ڈاکٹر جمعیت سنگھ ہی کو فون کیا جاتا تھا۔(۲۴) یہ آخری وقت میں بھی اقبال کے پاس تھے۔(۲۵) اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد چونیاں میں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ وہاں ایک گیانی سنگھ شعلہ بیاں مقرر تھا۔ اس نے اعجاز احمد سے اقبال کی خدمت میں جا کر مسلمان ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اعجاز احمد نے گیانی سنگھ کے قبولِ اسلام کی خواہش کا اظہار مع شرائط اقبال کے نام ایک خط میں کیا۔ اقبال نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

"۔۔۔۔ باقی رہا بیدی صاحب کا معاملہ۔ سو تم نے ان کو ٹھیک لکھا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں کوئی منظّم جماعت ایسی نہیں کہ مسلمانوں کے لیے کوئی انتظامِ معاش کر سکے۔ ابھی چند روز ہوئے مجھے پنجاب کے ایک مقام سے خبر آئی کہ کئی ہزار سکھ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہیں۔ بشرط یہ کہ ان کے لیے زمین کا انتظام کر دیا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس، تین چار معزّز سکھ اور ہندو میرے پاس آئے کہ اگر ان کی ملازمت کا بندوبست ہو جائے تو وہ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہیں۔۔۔۔ غرض، بالعموم اس قسم کے حالات میں دُنیوی محرکات عمل کرتے ہیں۔ بہرحال اگر بیدی صاحب کی توقعات کا حال معلوم ہو تو میں یہاں کسی انجمن سے گفت گو کروں۔ اُن کے خط میں مطالبات کا کہیں ذکر نہیں۔ عام طور پر اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ تبدیلیٔ مذہب سے کسی کا مقصود محض منفعتِ مادی ہے، تو وہ اسے نہایت مکروہ جانتے ہیں۔(۲۶)

گیانی سنگھ کی خواہش پر اعجاز احمد گیانی سنگھ کو اقبال کی خدمت میں لائے تو اُنھوں مسلمان ہونے کے لیے مالی امداد کی شرط رکھ دی۔ اقبال گیانی سنگھ کی زبانی مالی امداد کا سُن کر متاسف ہوئے اور کہا کہ مسلمان ہونے کے لیے مالی امداد کی شرط کسی طرح پسندیدہ نہیں ہے۔ پھر اقبال نے اُسے ایک واقعہ سنایا۔ فقیر سید وحید الدین نے "روزگارِ فقیر" جلد اوّل میں اسے نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"میرے والد صاحب گوجرانوالہ میں ایک بزرگ سے ملنے گئے۔ بزرگ گاؤں سے باہر چارپائی پر بیٹھے چند صاحبوں سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک جنگلی خرگوش جس کے پیچھے کتّے لگے ہوئے تھے بھاگتا ہوا ادھر آیا۔ اور چارپائی کے نیچے بیٹھ گیا۔ اُس خرگوش کا جو کتّے پیچھا کر رہے تھے۔ وہ چارپائیوں پر آدمیوں کو بیٹھا

دیکھ کر ٹھہر گئے؛ بلکہ یوں کہیے کہ وہ ٹھٹھک کر رہ گئے؛ وہ یہ منظر دیکھ رہے تھے، اُنھوں نے خرگوش کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اے عقل مند پناہ بھی لی تو انسان کی''

اقبال یہ واقعہ سناتے ہوئے سراپا سوز تھے۔گیانی سنگھ نے اس کی حکیمانہ مثال کو کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا، خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔(۲۷)

اقبال اور سکھ مذہب:

اقبال نے سکھ مذہب کا بھی گہرا مطالعہ کر رکھا تھا جس کا اندازہ ان کے اُردو اور فارسی کلام میں موجود اشعار سے ہوتا ہے۔ان اشعار کے پس منظری مطالعہ کے لیے ہم پہلے سکھ مذہب کے تصوّرِ توحید اور تصوّرِ مساوات کا جائزہ لیں گے تا کہ اقبال کے نقطہ نظر کا جائزہ لے کر کسی حتمی نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔

بابا گورو نانک دیو جی سکھ مذہب کے بانی ہیں۔(28) میرین ڈبلیو سمتھ اپنے مضمون ''سکھ'' میں لکھتے ہیں:

"Guru Nanak, founder of the sikh religion and its first guru(teacher(was a 16th century Hindu mystic."(29)

ترجمہ :(گرو نانک جو سکھ مذہب کے بانی اور سب سے پہلے گرو سمجھے جاتے ہیں۔سولہویں صدی کے ایک ہندو صوفی تھے۔)

بابا گورو نانک دیو جی سلطان بہلول لودھی کے عہد میں (۳۰) پانچ سو سال قبل تلونڈی، موجودہ ننکانہ صاحب، ضلع شیخوپورہ واقع پنجاب، پاکستان میں 1429ء میں ایک متوسط ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔(۳۱) ان کے والد کا نام کلیان چند عرف بابا کالو جی، والدہ ترپتا اور بہن کا نام نانکی بیان کیا گیا ہے۔اِن کے والد سخت مزاج جب کہ والدہ نرم مزاج خاتون تھی۔(۳۲) کہا جاتا ہے کہ نانک دیو جی والدین کی آخری عمر کی اولاد تھے۔اُن کے والد نے ایک مسلمان بزرگ بابا مراد المعروف نولکھ ہزاری سے دعا کرائی تھی۔اُنھوں نے دُعا کے بعد بشارت دی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ایسا نامور اور صالح بیٹا عطا فرمائیں گے جس کی شہرت کا روئے زمین پر چار سو ڈنکا بجے گا۔(۳۳) بابا گورو نانک دیو جی کی پیدائش پر خاندانی پروہت سے جنم پتری بنوا کر اس کے مطابق نانک نرنکاری (بے شکل خدا کا پجاری) کا نام رکھا گیا۔پروہت نے بھی بابا نانک دیو جی کے گیانی دھانی (سچ ماننے والا)

ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔(۳۴)

روایت ہے کہ باباجی گورونانک پانچ سال کی عمر میں جب باہر کھیلنے نکلتے تو گھر سے جو بھی چیز لے کر جاتے فقیروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔(۳۵)اور کھیلنے کی بجائے بچوں سے توحید کے متعلق گفت گو کیا کرتے تھے۔ (۳۶)سات سال کی عمر میں باباجی گورونانک کی تعلیم کا آغاز ہوا۔اُنھوں نے ہرگوپال سے ہندی پنڈت برج سے سنسکرت(۳۷)اور مسلمان بزرگ اساتذہ مولوی قطب الدین اور سیّد حسن سے تعلیم حاصل کی۔(۳۸)بہت کم عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عربی،فارسی اور ہندی زبانوں کا علم رکھتے تھے۔(۳۹)

مسلمان بزرگ اساتذہ سے علم حاصل کرنے کے ساتھ ان کی روحانی تربیت کا آغاز ہوا۔(۴۰)اِسی تربیت کا اثر تھا کہ اُنھوں نے گیارہ سال کی عمر میں جنیو پہننے سے انکار کر دیا۔اُن کے والد نے کھیتی باڑی کی طرف راغب کرنا چاہا تو اس سے بھی انکار کر دیا۔بڑی مشکل سے گلہ بانی پر آمادہ ہوئے لیکن اِس دوران مسلسل فقیروں سے ملتے رہے۔اُن کے والد نے فقیروں سے دور رہنے اور دنیاداری کی طرف راغب رکھنے کے لیے ایک مرتبہ رقم دے کر نفع پر سامان خریدنے بھیجا لیکن بابا گورونانک دیو جی رقم بھوکے سادھوؤں کے کھانے کے بندوبست میں خرچ کر کے گھر لوٹ آئے۔باپ ناراض ہوا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو کہا آپ نے منافع والا سودا خریدنے کو کہا تھا۔اس لیے سب سے بڑھ کر منافع والا سودا کیا ہے۔(۴۱)

بعدازاں بابانانک دیو جی کے والد نے اُنھیں سلطان پور نانکی کے پاس بھیج دیا۔اُن کے بہنوئی نے نواب دولت خاں لودھی کے مودی خانے میں ملازمت دلوادی۔پھر اُنیس سال کی عمر میں بابانانک دیو جی کی شادی کر دی گئی۔اُن کے دو بیٹے ہری چند اور لکھی داس پیدا ہوئے۔ہری چند نے اداسی فرقے کی بنیاد رکھی۔(۴۲)بابانانک ملازمت اور گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہونے کے بعد جنگلوں میں چلے جاتے اور مراقبے کیا کرتے تھے۔(۴۳)ایک روایت ہے کہ ایک روز پہر رات رہتے ہوئے بین ندی(۴۴)میں نہاتے ہوئے اُنھیں الہام ہوا کہ مودی خانے کا کام چھوڑ کر خلق خدا کو فیض یاب کرو۔(۴۵)ندی میں دو یا تین دن رہنے کے بعد جب باہر نکلے تو ایک دن جنگل میں خاموشی سے گزارا اور پھر نعرہ بلند کیا:

نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان

اس کے بعد بابا گورونانک نے مودی خانے کی ملازمت کو خیرباد کہا اور مُبلغ بن گئے۔(۴۶)

صوفی غلام تبسّم لکھتے ہیں:

”ان کی گفتگو میں مٹھاس اور تاثیر تھی۔ ہر مذہب کے لوگ ان کے پاس کھچے چلے آتے تھے۔اس لیے کہ وہ ان سے خُلق سے پیش آتے اور کسی مذہب کے پیشوا کو برا نہ کہتے تھے۔“ (۴۷)

کنہیالال رقم طراز ہیں:

(۴۸)”غضب،قہر،بدمزاجی تو خالق حقیقی نے ان کے جسم میں پیدا ہی نہ کی تھی۔محبّت و رحم ولطف وسخاوت ان کی عادت تھی۔“

علامہ اقبال نے مذکورہ بالا اوصاف کی بنا پر ہی انھیں ”نانک شیریں بیاں“ کہا ہے اور ان کی تعریف وتوصیف کی ہے۔وہ ایک نظم میں ہندوستان کے حالات کی خرابی کا اشارہ کرتے ہیں اور دل برداشتہ ہو کر کہتے ہیں کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ دیں گے۔اِس لمحے انھیں انسانیت کی اصلاح اور روحانی تربیت کرنے والی ہستیاں یاد آنے لگتی ہیں،ان میں سے ایک بابانانک،بانیٔ سکھ مت بھی ہیں،جن کے اندازِ گفت گو کی اقبال نے تعریف کی ہے:

الوداع اے سرزمین نانک شیریں بیاں   رخصت اے آرام گاہ چشتیؒ عیسیٰ نشاں(۴۹)

گویا اقبال نانک کے کردار کے اس وصف سے متاثر ہیں۔علامہ نے نانک کے کردار کے علاوہ ان کی تعلیمات کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ذیل میں سکھ مذہب کے تصوّرِتوحید اور تصوّرِمساوات کا جائزہ لیا جارہا ہے تاکہ حقیقت بیان کی جاسکے۔

تصوّرِتوحید:

سکھوں کی مذہبی کتاب ”گوروگرنتھ“ بالخصوص ”جپ جی“ اور ”مول منتر“ میں خدا تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں جو تصوّر ملتا ہے۔اُس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بانیٔ سکھ مذہب،بابا گورونانک دیو جی خدائے واحد کے پرستار تھے۔انھوں نے تاحیات توحید کی تبلیغ کی۔گوروگرنتھ میں خدا کا اہم ترین نام ”ست“ (50) یعنی مطلق سچائی ہے اور یہی سچائی بنیادی حقیقت بھی ہے۔

جپ جی“ میں ہے:“

اونکار ست نام کرتا پُرکھ نِر بھو رِنَر ویر

اکال مورت اجونی سے بھنگ کرپرساد(۵۱)

ترجمہ :(خدا ایک ہے واحد، اُس کا نام سچا ہے، خالق کُل ہے۔ بے خوف، عداوت سے باہر، لافانی سروپ، پیدا ہونے اور جون میں آنے سے پاک ہے۔ گورو کی مہربانی۔)

بابا گورونانک توحید پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ خدا کی وحدانیت کا اعلانیہ اظہار کرتے ہیں:

آد نرنجن نرمل سوئی اور نہ جانا دوجا کوئی(۵۲)

ترجمہ:(اللہ روزِ ازل سے ہے۔ دنیوی آلائش سے پاک وصاف ہے۔ وہی مالک ہے دوسرا کوئی نہیں۔)

بابا گورونانک دیو جی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ احد خالق و مالک ہے۔ وہی زندگی اور موت دینے والا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جس پر چاہتا ہے اپنے فضائل اور رحمتوں کی بارش کرتا ہے۔ گورو گرنتھ ہی میں سورٹھ محلا ۱: میں اللہ کے ایک ہونے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

صاحب میرا ایکو ہے ایکو ہے بھائی ایکو ہے
آپے مارے آپے چھوڑے آپے لیوے دے ءِ
آپے ویکھے آپے وگسے آپے ندر کرئے
جو کچھ کرنا سو کر رہیا اور نہ کرنا جائی
جساور تے تسیو کہی اے سبھ تیری وڈیائی (۵۳)

ترجمہ:(میرا خالق اور مالک ایک ہی ہے (ہاں) بھائی وہ ایک ہی ہے۔ وہی مارنے والا اور زندہ کرنے والا ہے۔ وہی دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ وہی جس پر چاہتا ہے اپنے فضلوں کی بارش کرتا ہے۔ یعنی جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے بغیر اور کوئی بھی نہیں جو ان صفات کا حامل ہو سکے۔

جو کچھ دُنیا دُنیا میں ہو رہا ہے ہم وہی بیان کرتے ہیں۔ ہر چیز اللہ کی حمد اور بڑائی بیان کر رہی ہے۔)

بابا گورونانک دیو جی کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ اور اولاد سے پاک ہے۔ اس کا کوئی شجرۂ نسب نہیں اور نہ آئندہ کے لیے نسل ہے۔ وہ ان تمام باتوں سے پاک اور بلند ہے، سورٹھ محلا ۱:، میں ہے:

الکھ اپار اگم اگوچر نہ تس نہ کال نہ کرما جات اجات اجونی سنبھو نہ تس بھاؤ نہ برما

ترجمہ:(اے اللہ! تو عقل و ادراک سے بالاتر ہے۔ لامحدود نارسا ہے اور حدِ ادراک سے پرے ہے۔ تو کال (موت) اور کرما (پچھلے جنم کے اعمال) سے پاک ہے۔

تیری کوئی ذات نہیں تو لایلد ہے۔تیرا اپنے ہی نور سے ظہور ہوا ہے۔تو خوف،فکر اور اندیشہ سے بالاتر ہے۔ سچا سچیارہ ہے۔میں تجھ پہ قربان جاؤں تو شکل وصورت،رنگ ونقش سے بالاتر ہے۔تیرا کوئی نشان پتہ نہیں۔

نہ تو کسی کا باپ ہے نہ تیری کوئی اولاد ہے۔نہ عورت رکھتا ہے۔تو اکیلا،واحد نقص سے پاک ہے۔تیری ذات لاحد وشمار ہے۔)

وہ ''چپ جی'' میں مزید کہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ایشر،وشنو،برہما،لچھمی پاربتی سب خدا نہیں،اس کی قدرت کے مظہر ہیں۔(۵۵)وہ پوڑیوں میں کہتے ہیں خدا خالق ہے۔اس نے مخلوقات کو حرف ''کُن'' کہہ کر پیدا کیا۔(۵۶) اُسی نے رات،دن،موسم،چاند،سورج،آگ،ہوا،پانی اور دیگر تمام چیزوں کو پیدا کیا۔(۵۷)ہمیں موت کے بعد اسی کے حضور حاضر ہو کر نیک اور بداعمال کا جواب دہ ہونا ہے۔(۵۸)اس لیے ہمیں ہر وقت اُسی کو یاد کرنا چاہیے(۵۹) تاکہ جنم کے چکر سے نجات مل جائے۔(۶۰)

بابا گورونانک نے اللہ تعالیٰ کا سروپ بھی بیان کیا ہے۔ایک ''نرگن'' اور دوسرا ''سرگن''،اِن دونوں پہلوؤں کو اُنھوں نے نظم آرتی میں قلم بند کیا ہے۔وہ راگ دھنا۔سری محلا۔ا،میں کہتے ہیں:

سُہس تو نین نن نین ہہہ توہِ کو   سُہس مورت ننا ایک تو ہی
سہس پَد بِمل نن ایک ید گندھ بُن   سہس تو گندہ او چلّت موہی
سبھ مَہ جوت جوت ہے سوئے   تس کے چانن سب منہ چانن ہوئے(۶۱)

ترجمہ:(اے اللہ) تیری ہزارہا آنکھیں مگر درحقیقت تیری ایک بھی (مادی) آنکھ نہیں۔تیری ہزارہا شکلیں ہیں مگر تیری ایک بھی (مادی)شکل نہیں۔

تیرے ہزارہا پاؤں ہیں۔مگر فی الحقیقت تیرا ایک بھی (مادی) پاؤں نہیں۔تیرے ہزارہا نشانات ہمیں سرور دے رہے ہیں۔

ہر چیز میں تیرا جلوہ ہے اور ہر چیز تیرے نور ہی سے منور ہے اور وہ نور مرشدِ کامل کے اپدیش میں ظاہر ہوتا ہے۔)

بابا گورونانک دیوجی کے فارسی کلام میں بھی اظہارِ بندگی کے مؤثر نمونے ملتے ہیں،وہ راگ تلنگ محلہ ا:گھر،میں گویا ہیں:

یک عرض گفتم، پیش تو، دو گوش کن کرتار حقا، کبیر کرتم تو ھے بے عیب پروردگار
دُنیا مقام فانی، تحقیق دل دانی مم سرمُوئِ عزرائیل گرفته دل،یچ نه دانی
زن،پسر،پدر برادر رہ کس نیس دستگیر آخر بیفتم کس نه دارد،چوں شو دتکبیر (۶۲)

ترجمہ :(اے خالق و مالک! میری تیرے حضور التجا ہے کہ تو اسے شرفِ قبولیت بخش تو سب سے بڑا، کریم اور بے عیب پروردگار ہے۔

مَیں نے یہ حقیقت بڑی تحقیق کے بعد ٹھیک سے مانی ہے کہ یہ دنیائے دوں فانی ہے۔ادھر موت کے فرشتے عزرائیل نے سر سے میرے بال پکڑ رکھے ہیں مگر میرا دل اس موت کے خوف سے غافل ہے۔

یہ میرے اہل وعیال، بیوی، بچے والدین اور بھائی موت کے مرحلے میں کوئی بھی میرا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہوگا۔جب میں بے جان ہو کر گر پڑوں گا اور میری تکبیر نمازِ جنازہ پڑھائی جائے گی۔)

ظاہراً یہ کلام موت اور زندگی کا فلسفہ پیش کرتا ہے لیکن درحقیقت حقیقتِ کبریٰ کے حضور عاجزی اور اظہارِ بندگی مقصود ہے۔

بابا گورونانک دیوجی کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ کے در کے بھکاری ہیں ۔ہمیں ہر کام کے لیے اسی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیے۔سورٹھ محلا ۱: ، میں ہے :

تو پربھ داتا، دان مت پورا، ہم تھارے بھکاری جیئو میں کیا مانگو تجھ تھر نہ رہائی، پر دیجیے نام پیاری جیئو (۶۳)

ترجمہ :(اے دونوں جہانوں کے مالک! حقیقی داتا تو ہی ہے۔ہم تیرے ہی در کے بھکاری ہیں لیکن کیا مانگوں (سوچ میں ہوں) کیونکہ ہر شے فانی ہے۔(لہٰذا) میں تجھ سے تجھی کو مانگتا ہوں۔)

گورونانک دیوجی اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ ہر شے میں جلوہ گر ہے۔جب کسی شخص کو اللہ کے جلوے نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں تو وہ ہی حقیقی مواحد ہوتا ہے اور یہ مقام خدائے واحد کے فضل ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، وہ راگ ملہار میں کہتے ہیں:

سبھنا میہ ایکو ایک دکھائے جاں ایکو دیکھے تاں ایکو جانے
جاں کو بخشے میلے سوئے ایتھے اوتھے سوا سکھ ہوئے
کہت نانک کون بدھ کرے کیا کرے سوئی مکت جاں کو کرپا ہوئے
ان دن ہر گن گاوے سوئے شاستر بید کی پھر کوک نہ ہوئے(۶۴)

ترجمہ: (ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ موجود ہے اور اگر انسان کو یہ مقام مل جائے کہ اسے ہر چیز میں اللہ کا جلوہ نظر آنے لگ جائے تو یہ انسان حقیقی معنوں میں توحید کا پرستار کہلانے کا مستحق ہے۔

اور یہ مقام محض اپنی کوشش سے ملنا ناممکن ہے بلکہ اللہ کی دین ہے، جسے وہ بخشتا ہے وہ ہی پا سکتا ہے۔

نانک کہتے ہیں کہ کوئی کیسی ہی ترکیب کر لے نجات صرف اُسے ہی ملے گی جو اللہ تعالیٰ کے فضلوں کا وارث ہو اور اسی کو ہی دن رات ذکرِ الٰہی کرنے کی توفیق ملتی ہے اور ایسا شخص ویدوں اور شاستروں کی رسومات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔)

بابا گورو نانک توحید کے ساتھ ساتھ شریعت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم سے بھی محبّت کرتے تھے۔ ''پراتن جنم ساکھی'' میں لکھا ہے:

ملاحتِ محمدی مکھ ہی آکھونت خاصہ بندہ سجیاں سر متراں ہوں مت (۶۵)

ترجمہ: (نبی کریم صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کے چہرہ مبارک کی ملاحت ہی ہمیشہ بیان کرتے رہو۔ وہی خاص ہستی اس مذہب کی سردار بن کر آئی اور سرداری محبّت کی وجہ سے ہے۔)

وہ آپ ﷺ واصحابہ وسلم کی ہستی کو باعثِ نجات جانتے تھے۔ پراتن جنم ساکھی میں ایک اور مقام پر بابا نانک دیو جی کا بیان درج ہے:

''سیٹی چھوٹے نانکا حضرت جہاں پناہ'' (۶۶)

ترجمہ: (اے نانک حضرت جہاں پناہ کے کہنے سے ہی نجات ملے گی۔)

باباجی گورو نانک شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم پر بھی یقین رکھتے تھے۔

''دبستانِ مذاہب'' میں لکھا ہے:

''نانک پنتھیا کہ معروف بگرو سکھا نندبہ بت و بت خانہ اعتقاد ندا رند..... نانک قائل بتوحید باری بود و بہ امور یکہ منطوق شرع محمدی ہست'' (۶۷)

ترجمہ: (نانک پنتھیا جو سکھوں کے گورو ہیں۔ وہ بت پرستی اور بت کدے پر یقین نہیں رکھتے۔۔۔ نانک توحیدِ باری تعالیٰ کے اور ان باتوں کے جو شریعت محمدیؐ میں بیان کی گئی ہیں، قائل تھے۔)

سکھ مذہب کے بانی بابا گورو نانک کے پیش کردہ تصوّرِ توحید کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے

کہ کلام نانک گورو گرنتھ صاحب کا بنیادی موضوع توحید ہے۔ بالخصوص بابا گورونانک جی کا کلام اور نظریات مشرکانہ تعلیم سے پاک ہیں۔ باباجی اور دیگر نو گورو صاحبان نے گورو گرنتھ میں جگہ جگہ توحید کا مضمون بیان کیا ہے اور کلام میں اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کا بکثرت ذکر کیا ہے۔ اس سے ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کے مختلف صفاتی ناموں کا تعارف کراتے ہوئے توحید کی وسعتوں کا شعور اُجاگر کرنا اور عام آدمی کو خدا کی قدرتِ کاملہ کے ادراک کی سمجھ کے قابل بنانا ہے تاکہ وہ اس سے آگاہی کے بعد خود اپنے مقام سے آشنا ہو۔ لہٰذا بابا گورونانک نے عبادت کو خدا اور بندے کے تعلق کا ذریعہ بتایا اور اس اَمر کو فروغ دیا کہ خدا تک رسائی اُسے صاف نیت سے یاد کرنے میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے دیگر رسوم اور عقائد کی پیروی ضروری نہیں۔

بابا گورونانک دیو جی کی توحید کی تعلیم نئی نہیں۔ اِن سے قبل بھی مسلمان اولیا کرام اور کئی ہندو بھی خدائے واحد کی عبادت اور معاشرتی مساوات کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ اقبال نے اس مساعی جمیلہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''بانگِ درا'' میں نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' ہے۔ اس نظم میں اقبال نے ہندوستانی بچے کی زبانی بات کی ہے۔ اگرچہ کچھ تلمیحات محلِ نظر ہیں۔ ہمیں یہاں ان سے بحث نہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیرؒ اور نانک بانیٔ سکھ مذہب کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس میں ابہام کی کوئی گنجائش نہیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بھی توحید کا پیغام عام کیا اور یہی فریضہ بابا نانک نے بھی سرانجام دیا۔ وہ نظم کا آغاز ہی ان دو ہستیوں کے پیغامِ توحید کے ذکر سے کرتے ہیں:

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
وحدت کی لے سنی تھی دُنیا نے جس مکاں سے　　میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے (۶۸)

یعنی جس سرزمین میں چشتیؒ نے پیغامِ حق سنایا ہے۔ جس باغ میں نانک نے خدائے واحد کے ایک ہونے کا گیت گایا ہے۔ جسے تاتار کے باشندوں نے فتح کرنے کے بعد اپنا دیس بنایا اور جہاں عرب مجاہدین نے حکومت کے پرچم گاڑے، وہی میرا وطن ہے، وہی میرا دیس ہے۔ درحقیقت اقبال کو وحدت کا یہی گیت مرغوب ہے۔ اس لیے کہ یہی نغمہ سرمدی خدا اور بندے کے تعلق کی بنیاد ہے۔ اسلام بھی اپنی تعلیمات میں یہی تصوّر پیش کرتا ہے۔ خدا اور بندے کا یہ تعلق مساوات کو جنم دیتا ہے۔ ذات پات علاقے اور حسب نسب کے بندھن اس کے سامنے بے معنی ہیں۔ ''سکھ مذہب کا

بھی اصل اصول یہی ہے کہ دُنیا میں آدمی سب برابر ہیں، عبادت صرف خدا ہی کی کی جائے۔"

تصوّرِ مساوات:

بابا گورونا نک دیوجی ہندو گھرانے کے فرد اور ہندو معاشرے کے باسی تھے۔(۷۰) ہندو ذات پات پر سختی سے یقین رکھتے تھے۔وہ چار ذاتوں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر میں تقسیم تھے۔یہ تقسیم پیدائشی ہوتی تھی۔اِن ذاتوں کے فرائض متعیّن تھے۔برہمن کا کام پڑھنا، پڑھانا اور دان لینا وغیرہ تھا۔ایسے ہی کھشتری کا کام لڑنا اور ملکی انتظامات کرنا، ویش کا کام تجارت اور کھیتی باڑی کرنا اور شودر کا کام لوگوں کی خدمت کرنا تھا۔شودروں سے بھی نیچے ایک طبقہ انتر کا تھا۔پیشے کے اعتبار سے اس میں آٹھ فرقے، دھوبی، موچی، بازی گر، ٹوکریاں اور ڈھال بنانے والے کاریگر و ملاح، مچھیرے، درندوں کے شکاری اور جولاہے شامل تھے۔انتر چار ذاتوں کی رہائشی آبادیوں میں سکونت پذیر نہیں ہوسکتے تھے۔گاؤں سے قریب گاؤں کے باہر مکان بنا کر رہتے۔ایسے ہی ہاڑی ڈوم، چنڈال اور بدھتو کسی فرقے میں شامل نہیں۔ان کا کام صفائی اور دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔(۷۱) بابا نانک نے ذات پات کی نفی کی اور انسانی مساوات کا درس دیا، راگ آسا محلا ا: ، میں ہے:

جانو جوت نہ پوچھو جاتی آگے جات نہ ہے(۷۲)

ترجمہ: (اندر کی روشنی تلاش کرو۔ذات نہ پوچھو (کیوں کہ) بعداز موت کوئی ذات نہ ہوگی۔)

پھکڑ جاتی پھکر ناوَ سبھنا جیا اکا چھاوَ
آپہنہ جیکو بھلا کہا جائے نانک تا پر جا پے جابت سیکھے پائے(۷۳)

ترجمہ: (ذات پات کا سوال فضول اور بیہودہ ہے۔ذات پات کی بڑائی ہی بے معنی ہے۔تمام مخلوق کا سہرا خدائے واحد ہی ہے۔
اگر کوئی خود اپنے آپ کو معزز خیال کرتا ہے تو اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ اگر وہ خدا تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے تو معزّز ہے۔)

عباد اللہ گیانی رقم طراز ہیں:

"گورونانک جی کے دل میں بت پرستی سے بھی سخت نفرت اور ذات پات سے بھی آپ کو کوئی لگاؤ نہ تھا اور اسی طرح دوسرے تمام ہندو عقائد اور رسومات سے بھی آپ کو کوئی واسطہ یا تعلق نہ تھا اور وہ ان سب کو رد کرتے تھے۔" (۷۴)

توحید اور مساوات کو سکھ مذہب میں بنیادی مقام حاصل ہے۔ بانی سکھ مذہب بابا گورو نانک جی نے توحید کی تعلیم دی اور ذات پات کی نفی کر کے انسانی بھائی چارے پر زور دیا۔ انھوں نے جو برادری تشکیل دی اس پر خود کو ہرگز فوقیت نہ دی۔ اپنی زندگی ہی میں گورو کے عہدہ سے سبکدوش ہونا، اپنے بیٹوں کی بجائے گورو انگد کو اپنا جانشین مقرر کرنا، اونچی جگہ بٹھا کر تحائف پیش کرنا اور اپنی تعلیمات کی پیروی کرنے والوں کے ہمراہ ان کے سامنے عقیدت سے سر جھکانا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ خود بھی اُنھی میں سے ہیں۔(۷۵) برتری اور فضیلت اعمال و افعال کی بنا پر ہے۔ جو فرائض تندہی سے سرانجام دے اور اچھے اعمال پیش کرے، اس کا احترام واجب ہے۔ پھر اس سے ضرورتِ مرشد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اقبال نے بابا گورو نانک دیو جی کی ان تعلیمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"بانگِ درا" کی نظم "نانک"، میں اقبال نے نانک کو توحید کے مبلغ اور ذات پات کی نفی کرنے والی نمائندہ ہستی کے طور پر پیش کیا ہے اور ان کی اس جمیلہ مساعی کی تعریف کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مدت کے بعد ہندوستان میں پھر ایک شخص (نانک) پیدا ہوا جس نے توحید کا پرچم بلند کیا اور ہندوؤں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ ان کی مثال ایسے ہی ہے

جیسے ابراہیمؑ بت پرست آزر کے گھر پیدا ہوئے اور بت شکن بنے۔ ایسے ہی بابا گورو نانک بھی ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن بت پرستی کی بجائے توحید کے مبلغ بنے:

بت کدہ پھر بعد مُدّت کے مگر روشن ہوا — نورِ ابراہیمؑ سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اُٹھی آخر صدا، توحید کی پنجاب سے — ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے(۷۶)

اقبال نے بابا نانک دیو جی کو توحید کی تعلیمات عام کرنے کی وجہ سے ہند کے بت خانہ میں "کعبے کا معمار" قرار دیا ہے، وہ بابا گورو نانک جی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

تیرے پیمانے میں اے ساقی شرابِ ناب تھی — تیری شخصیت نے کھینچا ہر دل آگاہ کو
اپنے میدانوں میں جب رزمِ ممالک عام تھی — زندگی تیری سراپا صلح کا پیغام تھی
ہند کے بت خانے میں کعبے کا تو معمار تھا — کتنا باطل سوز تیرا شعلہ گفتار تھا(۷۷)

یعنی نانک جی کی سچی تعلیمات کی وجہ سے ہر دل آگاہ ان کی طرف مائل ہوا۔ انھوں نے نہ صرف پاک و ہند میں بلکہ دیگر ممالک میں بھی پیغامِ حق پہنچایا۔ وہ سراپا صلح تھے۔ انھوں نے اس وقت خدائے واحد کی عبادت کی

تعلیم دی جب ہندوستان میں بت پرستی زوروں پر تھی۔گویا انھوں نے بت کدے میں کعبہ کی معماریت کا آغاز کیا۔ان کے شعلۂ گفتار نے باطل کو جلا کر راکھ کر ڈالا اور یوں فریضۂ ابراہیمی ادا کیا۔سچ تو یہ ہے کہ اقبال نے بابا نانک سے ان کے اس کامیاب مشن پر عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

تبلیغی اسفار:

بابا گورونانک جی کی جنم ساکھیوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے توحید کی تبلیغ اور مساواتِ انسانی کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے کئی سفر کیے۔

ان کا پہلا باقاعدہ سفر سلطان پور سے شروع ہوا تو وہ 1497ء سے 1509ء تک پنجاب کے مختلف شہروں میں پھرتے رہے۔پہلے لاہور پھر ایمن آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں ایک ہندو جاگیردار ملک بھاگو کو انھوں نے خدا کا درس دیا۔(۷۸) سیالکوٹ میں اب بھی وہ بیری کا درخت موجود ہے جس کے نیچے بیٹھ کر انھوں نے حمزہ غوث کے سامنے سچائی کا پرچار کیا۔(۷۹) 1501ء میں وہ چونیاں کے راستے ہندوستان کے مذہبی مرکزوں اور پرتھوں کی طرف تبلیغ کی خاطر روانہ ہوئے اور بنارس میں ایک بزرگ کبیر سے ملے۔اس سفر کے دوران بابا نانک بنگال، بنگلہ دیش اور آسام بھی گئے اور بیسیوں شہروں میں اپنا پیغام پہنچایا۔پانچ سال بعد سلطان پور آئے۔(۸۰)

دوسرا سفر انھوں نے 1510ء میں اختیار کیا اور پھر بہت سے شہروں میں گئے۔یہ سفر جنوبی اور مغربی ہند کی طرف تھا۔چناں چہ دیگر مقامات کے علاوہ بابا گورونانک جی اجمیر، پٹن، ناسک، راس کمار، چتوڑ، سومنات اور اچ شریف بھی گئے۔اس سفر کے دوران انھوں نے تلونڈی آ کر اپنے والدین سے بھی ملاقات کی۔اس کے بعد سلطان پور بہن کو ملنے کے لیے گئے۔ 1515ء میں وہ تحصیل شکرگڑھ (ضلع سیالکوٹ) کے ایک گاؤں کاھنور میں آئے اور ایک ہندو دودھا جٹ کے مشورے سے یہاں دریائے راوی کے بائیں کنارے ایک نئے گاؤں کرتار پور (تحصیل شکرگڑھ ضلع سیالکوٹ پاکستان) کی بنیاد رکھی اور اپنے بیوی بچوں کو بھی یہیں لے آئے۔1515ء (۸۱) ہی میں بابا نانک جی نے تیسرا سفر اختیار کیا۔یہ سفر کلو اور چنبہ کے پہاڑی علاقے کشمیر، نیپال، سکھم اور بھوٹان کی طرف تھا۔حسبِ دستور بہت سے شہروں میں پہنچے، دشوار گزار راستے طے کیے اور سلطان پور ہمشیرہ کے پاس آئے پھر کرتار پور چلے گئے۔(۸۲) دائرہ معارفِ اسلامیہ اُردو میں لکھا ہے کہ اُنھیں اپنے مشن کی ایسی لگن تھی کہ کسی مشکل کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔(۸۳)

1517ء میں بابا نانک جی نے چوتھا سفر اختیار کیا۔اس سفر کے دوران ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی

خان، جام پور، شکار پور اور حیدر آباد سندھ سے ہوتے ہوئے سورت گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھی پہنچے۔ یہاں جانے کی فرمائش مردانہ نے کی تھی۔(۸۴)

بابا گورو نانک جی کی جنم ساکھی بھائی بالا والی میں مرقوم ہے:

''گورو صاحب نے مکے کے پاس آ کر حاجیوں کی صورت بنائی۔ نیلے کپڑے پہنے، ایک ہاتھ میں عصا دوسرے میں تسبیح پکڑی، سر پر مصلی اٹھایا۔ بغل میں قرآن شریف دبایا۔ فقیر حاجی بن کر مکّہ کی مسجد میں جا بیٹھے اور کلام اللہ کی سورتیں پڑھنے اور حمدِ الٰہی گانے لگے۔(۸۵)'' دبستانِ مذاہب'' میں بھی لکھا ہے کہ بابا نانک ہاتھ میں تسبیح اور گردن میں زنار رکھتے تھے:

(۸۶)''نانک۔۔۔تسبیح مسلماناں در دست و زنّار در گردن داشتی۔''

ترجمہ: (نانک۔۔۔مسلمانوں کی تسبیح ہاتھ میں رکھا کرتے تھے اور گردن میں زنار ڈالتے تھے۔)

مکہ میں گورو نانک نے قاضی رکن الدین اور مولوی عبدالرحمن سے مباحثہ کیا۔(۸۷) مدینہ منورہ میں وہاں کے اماموں امام غوث، امام جعفر اور امام اشرف اعظم سے مباحثہ ہوا۔

''تواریخِ خالصہ'' میں درج ہے:

''(اماموں نے کہا) تمھارے کلام میں تاثیر ہے۔ اگر تم نبی کے کلمہ اور چار یاروں پہ ایمان لاؤ تو تمام دُنیا تمھاری مرید ہو جائے۔۔۔اور بڑا رتبہ حاصل ہو۔ تب انھوں نے جواب دیا کہ ہمارا اس نبیؐ اور چاروں اصحاب پر اعتقاد ہے جو ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور تمام دُنیا کو یکساں فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ چاروں عناصر ہمارے یار ہیں اور روح خدا کی مرسل ہے۔''(۸۸)

جنم ساکھی کلاں گورو نانک از بھائی لچھمن سنگھ میں حلیہ تھوڑا سا مختلف بیان کیا گیا ہے، بقول لچھمن سنگھ:

''تب گورو جی نے اپنا لباس ایسا کر لیا کہ جیسا اس ملک کے آدمیوں کا ہوتا تھا۔ سر پر کھڑی ٹوپی اور ہاتھ میں آسا یعنی عصا اور گلے میں کفنی پہر کے اون کے ساتھ ہی سوار ہو گئے۔ جب پار اتر کر حاجیوں کے ساتھ پہنچے تب سب مکانوں کی سیر کی۔(۸۹)

بابا نانک جب ہندوستان لوٹے تو ان کے تبرکات کے ذخیرہ میں ایک جبّہ، (چولہ) ایک نسخہ حمائل شریف (قرآن پاک) جسے سکھ اپنی زبان میں ''مقدس پوتھی'' کا نام دیتے ہیں اور ایک تسبیح (مالا) لائے جو تا حال گورو

ہرسہائے ضلع فیروز پور (بھارتی پنجاب) میں ایک سکھ خاندان کے پاس محفوظ ہے۔ یہ نہایت ادب کے ساتھ ریشمی غلافوں میں بند ہیں۔ سکھ ایک سو روپیہ نذر اور ایک سو ایک مرتبہ اشنان غسل کرنے کے بعد درشن کرتے اور سر جھکاتے ہیں۔(۹۰)

علامہ اقبال نے فارسی کلام میں بابا نانک کے سفرِ مکہ کے لیے اختیار کیے گئے حلیہ کی تصویر کشی کی ہے، وہ ''می باقی'' کی ایک غزل کے ایک شعر میں کہتے ہیں:

ددر دیر نیازِ من، در کعبہ نمازِ من زنّار بدوشم من، تسبیح بدستم من(۹۱)

ترجمہ: (کبھی میں دیر میں عجز و نیاز اختیار کرتا ہوں اور کبھی کعبے میں نماز پڑھتا ہوں۔ کبھی میرے کاندھے پر زنار ہوتا ہے اور کبھی میرے ہاتھ میں تسبیح۔)

اس شعر کو پڑھتے ہی ذہن بابا گورو نانک دیو جی کے حلیہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اقبال نے کمالِ فن سے بابا گورو نانک کے اسفار اور حلیے کی تصویر کشی صرف ایک شعر میں کر دی ہے جو اختصار و جامعیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس واقعہ سے اقبال کی فکرِ رسا یہ نکتہ اخذ کرتی ہے کہ عاشق ہر شے میں اور ہر مقام میں خواہ وہ دیر ہو یا حرم خدا تعالیٰ کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اس لیے وہ دیر و حرم کے امتیازات کو مٹا ڈالتا ہے اور اس کی نظر میں زنار اور تسبیح میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

بابا نانک نے ہندوستان کے تمام اہم مقامات اور مسلمان اولیا کے مزاروں کی سیر کی۔ جہاں بھی گئے پنڈتوں اور صوفیوں سے مباحثے کرتے رہے اور ان کے مذہبی عقائد اور رسوم کو بے نتیجہ ثابت کرتے رہے۔ مخاطبین کو نفس کشی کی تعلیم دی، ابدی سچائیوں کا پرچار کیا(۹۲) اور یہی دو اصول سکھ مذہب کی بنیاد ٹھہرے یعنی وحدانیت اور ایک انسانی برادری۔

درحقیقت بابا گورو نانک دیو جی نے اس راز کو پالیا تھا کہ خدا کو ایک مانے بغیر اور ذات پات کے بندھنوں کو توڑے بغیر سماجی اصلاح اور معاشرتی ترقی ممکن نہیں۔ جب تک اعلیٰ اور معزز پیدائش کا نظریہ برقرار رہے گا تب تک ظاہر پرستانہ سچائی آگے بڑھنے اور دل کو ناپاک کرنے میں بڑی رکاوٹ بنی رہے گی۔ لہٰذا اُنھوں نے ذات برادری کے نظام کو مسترد کر دیا۔ اُنھوں نے اس کی عملی مثال پیش کی۔ اپنی وفات سے قبل ایک مخلص مرید وانگد کو سکھوں کے گورو کی حیثیت سے اپنا جانشین مقرر کیا۔ حالانکہ گورو نانک کے دو بیٹے بھی حیات تھے۔ نامزدگی کی رسم ادا کرنے کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ وانگد خود وہی ہیں اور ان کی اپنی روح اس میں حلول کرے گی۔ بابا گورو نانک جی پہلے ہی

مسئلہ تناسخ ارواح کی اشاعت کر چکے تھے،لیکن اس خاص اعلان سے سکھوں میں یہ عقیدہ مستحکم ہوگیا کہ باباجی کی روح ہر آنے والے گرو میں باری باری منتقل ہوتی رہے گی۔یہی وجہ ہے کہ ان سب نے اپنی تحریروں میں اپنا قطعی نام نانک اختیار کیا۔(۹۳)

بابا گورونانگ جی نے ستر برس کی عمر میں 1596ء میں وفات پائی۔ہندو جسم جلانے لگے تو مسلمانوں اور سکھوں نے مخالفت کی۔قریب تھا کہ سخت فساد پیدا ہوتا۔ایک شخص نے کہا کہ مہاتما لوگ شریر چھوڑ کر نہیں مرتے۔ مناسب ہے کہ دونوں فریق ان کی طرف رجوع کریں۔دونوں فریق اس پر راضی ہو گئے لیکن جب وہ چتا کے قریب گئے تو لاش گم تھی۔خالی چادر اوپر پڑی تھی۔فریقین نے چادر بانٹ لی۔مسلمانوں نے اپنا ٹکڑا دفن کر دیا اور ہندوؤں نے جلا دیا۔دونوں نے ان کی ایک ایک یادگار بنا دی یعنی سمادھ اور مقبرہ۔(۹۴)وفات سے قبل انھوں نے وانگد کو گورو نامزد کیا تھا۔وانگد نے تیسرے گورو امر داس کو خود نامزد کیا۔(۹۵)اس کی گدی بائیس سال قائم رہی۔اس نے سکھوں کی معاشرتی تنظیم کا قدم اٹھایا اور سکھوں کی منجیاں قائم کیں۔(۹۶)اخلاقیات میں گورونانک کی تعلیمات کی روح کو قائم رکھا۔امر داس نے اپنے چہیتے مرید اور داماد رام داس کو مقرر کیا۔(۹۷)شہنشاہ اکبر نے اسے وسیع قطعۂ اراضی موضع سلطان ونڈ تونگ وغیرہ قصبات کی زمین کو گورو چک میں شامل کر کے معافی کی سند لکھ دی۔(۹۸)وہاں اس نے مقدس تالاب بنانا شروع کیا۔(۹۹)اس تالاب کی تکمیل پانچویں گورو ارجن کے ہاتھوں ہوئی۔(۱۰۰)جو امر داس کا بیٹا تھا۔یہ باپ کا جانشین ہوا اور گدی موروثی چیز بن گئی اس نے آدھ گرنتھ کو محنت سے مکمل کیا۔(۱۰۱)اور سکھ مذہب کی تبلیغ شروع کی۔خود کو سچا بادشاہ کے نام سے ملقب کیا،پھر گورو ارجن کا بیٹا ہرگوبند جانشین ہوا۔ہرگوبند نے سیاست اور اقتدار کے لیے حکمتِ عملی اختیار کی۔وہ جہانگیر بادشاہ کے خلاف دشمنی کے جذبات رکھتا تھا اور باپ کی موت اسی کی طرف منسوب کرتا تھا۔اس نے فوجی زندگی اختیار کر کے باپ کا انتقام لینے کی ٹھانی۔اس مقصد کے لیے اس نے عادی مجرموں،قذاقوں اور شورش پسندوں کی فوج تیار کی۔دریائے بیاس کے کنارے ایک قلعہ بنایا۔یہاں سے ساتھیوں کے ساتھ نکلتا،لوٹ مار کر کے پھر لوٹ جاتا۔(۱۰۲)مغل شہنشاہ جہانگیر نے اسے نظر بند کیا لیکن پھر آزاد کر دیا۔جہانگیر کی وفات کے بعد اورشاہ جہاں کی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی ہرگوبند نے کھلم کھلا سرکشی کی۔تین مرتبہ حاکمِ لاہور کی فوج کو شکست دی۔شاہ جہاں کی طرف سے انتقام کے خطرہ کے باعث پہاڑوں میں چھپ گیا اور وفات تک وہیں رہا۔(۱۰۳)ہرگوبند کے عہد میں سکھ مذہب میں تبدیلی پیدا ہوئی۔اب سکھ گورو صرف مذہبی رہنما ہی نہ تھا بلکہ فوجی قائد بھی تھا۔(۱۰۴)اس

کی وفات کے بعد اس کا پوتا ھر رائے گورو بنا۔اس کی وفات کے بعد سری ھرکشن رائے گورو بنا۔اس نے سکھوں کی مذہبی جماعت کو منظم کیا اور جنگجو قوم بنایا۔(۱۰۵)اس کے بعد گورو تیغ بہادر گدی نشین ہوا۔اس کے بعد گورو گوبند گدی نشین ہوا۔اس نے سکھ مذہب کے اصول بنائے اور جانشین مقرر کرنے سے انکار کر دیا اور گرنتھ کو گورو کا درجہ دے د یا(۱۰۶)اس نے سکھوں کی تنظیم ''خالصہ'' بنائی۔اور بابا گورونا نک کی طرح ذات پات کی رسم کے خلاف شدید جنگ شروع کی۔اس نے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے پاھل (سکھ مذہب میں داخلے کی رسم) جاری کی۔ (۱۰۷)13 پریل 1699ء کو آنند پور میں ایک اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس میں گورو گوبند سنگھ نے ایک برتن لیا۔اس میں پانی تھا۔پانی میں بتاشے گھول دیے گئے۔پھر اس محلول میں کرپان پھیر کر اسے امرت روپ بخش دیا۔سب سے چھوٹی ذات والے حاضرین کو کہا کہ ایک ہی جگہ سے امرت کو پئیں۔پھر خود آخر میں اسی جگہ منہ رکھا اور امرت کو پیا۔اس طرح ان کمزور اور بے کس لوگوں کو خالصہ کا روپ بخش کر انھیں نئی آن اور نئی شان سے نوازا۔اس موقع پر گرو صاحب کے سرکاری شاعر بھائی آنند لال گویا نے نعرہ بلند کیا ''راج کرے گا خالصہ آکی رہے نہ کوئی۔(۱۰۸)سکھ اس تنظیم کا حصہ بننے کی خواہش کرتے ہیں۔دراصل نوجوانوں کا خالصہ گروپ عقیدہ کے مطابق حق وعدل کے لیے عبادت اور جہاد کرتا ہے اور منشیات اور سگریٹ نوشی سے پرہیز کرتا ہے۔(۱۰۹)

اقبال نے اُردو اور فارسی کلام میں سکھوں کی تنظیم ''خالصہ'' کا ذکر کیا ہے جس سے ان کے جارحانہ روّیے کی عکاسی ہوتی ہے۔

''جاوید نامہ'' میں ایک نظم ''قصرِ شرف النسا'' ہے اس نظم میں اقبال نے ایک مسلمان خاتون شرف النسا کا ذکر کیا ہے۔شرف النسا قرآن حکیم کی تلاوت بڑی محبّت کے ساتھ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھ کر کیا کرتی تھیں۔اس وقت ایک مرصّع تلوار بھی پاس رکھتی تھیں۔انھوں نے یہ دو اشیا بعد از مرگ اپنے مقبرہ پر رکھنے کی وصیت کی تھی۔ان کی وفات کے بعد یہ وصیت پوری کی گئی۔1840ء تک یہ تلوار اور قرآن مجید سنگھ پورہ لاہور میں موجود ان کے مقبرے کے چبوترے پر رہے۔1840ء میں سکھوں نے خانہ جنگی کے دوران جب مساجد اور مقبروں کو نقصان پہنچایا ایک خالصہ (سکھ) مقبرہ کا دروازہ توڑ کر قرآن پاک اور تلوار لے گیا۔اقبال کو ایسے واقعات سے تکلیف ہوئی۔انھوں نے اس پر اظہارِ افسوس کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد اندر آں کشور مسلمانی بمرد(۱۱۰)

ترجمہ :(سکھ تلوار اور قرآن لے گئے اور مسلمانوں کی حکومت جاتی رہی۔)

پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"سکھوں کے دور میں پنجاب بھر کے مسلمان ہی کیا؟ مسلمانوں تک مٹادی گئی، کیونکہ خالصہ (سکھ) مسلمانوں کی شمشیر (یعنی حکومت ہی نہیں) بلکہ قرآن (نظریۂ حیات تک لے اُڑے) یعنی مساجد میں اصطبل بنادیے گئے اور اذان پر پابندی لگادی گئی۔ ذبیحہ بھی بند کردیا۔" (۱۱۱)

سکھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں اور انگریزوں سے اتحاد کرلیا۔ اقبال نے نظم "اتحادی حکومت کی مثلث" میں اس کا ذکر یوں کیا ہے:

ادھر یونین نے سکندر نکالا ادھر ہندووں نے نرندر سنبھالا
وہاں خالصہ جی کی محفل تو دیکھو جگندر کی لو نے کیا ہے اجالا
توقع دلاتی ہے بختیس خطی مثلث یہ بن جائے گی لامحالا(۱۱۲)

ایسے ہی ایک اور نظم "مالوی" ہے اس میں بظاہر تو مالوی پر طنز ہے۔ لیکن درحقیقت اقبال نے سکھ قوم کے ہندوؤں اور انگریزوں کی طرف جھکاؤ کا ذکر کیا ہے۔ یہاں بھی سکھوں کو خالصہ کے نام سے یاد کیا ہے:

اتنی خدمت کی ہے خلق اللہ کی دیکھئے ہوتے ہیں کب 'سر' مالوی
مسلم ناداں کو کیا معلوم ہے کس خدا کے ہیں پیمبر مالوی
خوب تھا یہ خالصہ جی کا بچن کب ہے گاندھی کے برابر مالوی
مردِ میداں گاندھی درویش خو اور کونسل کے سپیکر مالوی(۱۱۳)

ہم سکھ مذہب کے تصورِ توحید و مساوات کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد یہ جان چکے ہیں کہ اقبال نے اس مذہب کے بانی کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ دائمی اور ابدی نظریہ توحید ہے جس پر عمل کا نتیجہ مساوات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا سبب بابا نانک دیو جی کا کردار بھی ہے۔ ان سے شاعرِ مشرق اور دیگر افراد کو جو محبّت ہے اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ حالاں کہ سکھ اور مسلمان دو جدا جدا قومیں ہیں۔ دونوں میں عرصہ دراز تک کشمکش رہی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش بھی کرتی رہی ہیں۔ سکھوں نے پنجاب پر حکومت کے دوران مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔ اقبال نے فارسی کلام میں ظلم وستم کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مسجد شہید گنج لاہور میں ریلوے اسٹیشن کی طرف سے دہلی دروازے کے بائیں ہاتھ سرائے سلطان کے بالمقابل سڑک پر واقع تھی۔اس کے قریب مزار شاہ کاکو بھی تھا۔یہ مسجد عہد شاہ جہانی میں،عبداللہ خان شاہزادہ دارا شکوہ کے خان سامان نے بنوائی تھی۔یہ بعد میں لاہور کا کوتوال بن گیا تھا۔یہ مسجد متوسط درجہ کی تھی،ایک اچھا خاصا بڑا احاطہ،کشادہ صحن،تین محرابیں،تین گنبد اور عمارت پختہ تھی۔اس کے ساتھ ایک حمام بھی تھا۔یہ مسجد عبداللہ خاں کے نام سے معروف تھی۔یہ بھی سکھ گردی کی نذر ہوگئی۔ 1864ء میں اس پر گنڈا سنگھ اور گوردت سنگھ دو بھائی قابض ہو گئے۔ مسلمان مسجد سے کلیتاً بے دخل ہو گئے۔حتّٰی کہ مزار شاہ کاکو پر ہر سال جو عرس ہوتا تھا وہ بھی حکماً بند کر دیا گیا۔مسلمانوں نے مسجد کی واگزاری کے لیے رٹ کر دی لیکن 24 جنوری 1938ء کو ہائی کورٹ نے مسجد کی واگزاری کی اپیل خارج کر دی۔(۱۱۴) پھر اچانک 5 جولائی 1936ء کو سکھوں نے مسجد کو شہید کر دیا۔(۱۱۵) انہدام کے سانحہ سے مسلمانوں کی غیرتِ ملّی،عزت اور وقار کو جو ٹھوکر لگی اور وہ بھی اس صوبے میں جہاں ان کی اکثریت تھی،بلکہ کہنے کو حکومت بھی۔اس پر ہر مسلمان کا دل تڑپ اٹھا۔حضرت علامہ کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا۔انھوں نے ’مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق‘‘ میں اس مسجد کی یاد میں شعر کہے اور مسلمانوں کو اپنا محاسبہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ فقر اختیار کریں۔ صاحب فقر ہی ناقابل تسخیر قوت حاصل کرتا ہے:

مومناں را گفت آں سلطانِ دیںؐ　　مسجدِ من ایں همه روئے زمیں

الاماں از گردش نُه آسماں　　مسجدِ مومن بدستِ دیگراں

سخت کوشد بندۂ پاکیزه کیش　　تابگیرد مسجدِ مولائے خویش(۱۱۶)

ترجمہ: (نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تمام روئے زمین میرے لیے مسجد کر دی گئی ہے۔
نو آسمانوں کی گردش سے اللہ تعالیٰ بچائیں۔مومن کی مسجد (زمین) دوسروں کے ہاتھ آئی۔
اے پاک فطرت انسان تجھے سخت کوشش کرنی چاہیے تاکہ تو اپنے آقا کی مسجد لے سکے۔)

اقبال نے چند اشعار میں سکھ مذہب کے عقیدۂ توحید اور تصوّرِ مساوات کو بیان کیا ہے اور بانیٔ مذہب کو تحمل و بردباری سے ان تعلیمات کو عام کرنے پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔انھوں نے توحید کی تبلیغ کے لیے ان کے اختیار کردہ حلیہ کی تعریف کی ہے۔علاوہ ازیں سکھ مذہب کے پیروکاروں نے اپنے بانی کی دی ہوئی تعلیمات کے برعکس بنی نوعِ انسان بالخصوص مسلمانوں سے جو سلوک روا رکھا،اس کی طرف اشارے کیے ہیں۔ساتھ ہی مسلمانوں کی بے عملی پر نوحہ

کنائی بھی کی ہے۔ در پردہ انھوں نے سکھوں کو پیغام دیا ہے کہ اپنے بانی کی دی ہوئی خالص توحیدی تعلیمات کی طرف رجوع کریں تاکہ دُنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے اور ان کے بانی کے خواب کو پھر سے تعبیر مل جائے۔ بانی سکھ مذہب نے اس وقت فریضۂ ابراہیمی ادا کیا تھا جب برصغیر پاک و ہند ظلمت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا اور معاشرتی حوالے سے برہمن کو برتری حاصل تھی۔ بابا گورونانک جی نے نہ صرف وحدتِ بنی آدم کا تصوّر دیا بلکہ اس پر خود بھی عمل کیا۔ ان کے صاحب کردار ہونے پر اقبال نے انھیں ''مردِ کامل'' کہہ کر پکارا ہے اور ان کی شیریں بیانی اور شعلہ گفتاری کی تعریف کی ہے۔

ڈاکٹر جہانگیر تمیمی اپنی کتاب ''بابا گورونانک'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت علامہ اقبال نے گورونانک کے مسلک اور مشرب کو لے کر انھیں گورمکھی زبان میں ست گورو۔۔۔۔۔ یعنی سچا معلم گردانا ہے۔'' (۱۱۷)

اقبال نے بابا گورونانک جی کو مردِ کامل کہہ کر پکارا ہے۔ یہ نظریہ کوئی نیا نہیں، یہ تصوّر تصوّر قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے کہ بانی سکھ مذہب ایک فقیر موحد، صلح کل، خدا دوست، صاحبِ کشف و کرامت و بے طبع، صاحب عبادت و ریاضت اور ہر شخص اور ہر قوم سے دلی محبّت رکھتے تھے۔ (۱۱۸) گورونانک کی یہ تعلیمات عین اسلام ہیں۔

اقبال خود بھی تمام زندگی توحید کی تعلیم عام کرنے میں مصروف رہے۔ وہ توحید کی بنیاد پر فرقہ بندی، ذات پات اور مذہب سے بالاتر ایک عالمی برادری تشکیل دینا چاہتے تھے۔ ''بانگِ درا'' کی نظم طلوعِ اسلام میں گویا ہیں:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اُخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ جُراسانی، یہ افغانی، وہ تُورانی
تُو اے شرمندۂ ساحل، اُچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مرغِ حرم! اُڑنے سے پہلے پَر فشاں ہو جا (۱۱۹)

کلامِ نانک اور کلامِ اقبال کی چند فکری مماثلتیں:

اقبال اور سکھ مذہب کی مقدّس کتاب گورو گرنتھ، آدھ گرنتھ المعروف کلام نانک میں بھی کئی فکری و معنوی مماثلتیں موجود ہیں۔ جو الگ سے ایک مقالہ کی متقاضی ہیں۔ ذیل میں چند مماثلتوں کو بیان کیا جاتا ہے۔

بنیادی مذہبی عقائد میں عموماً توحید کے بعد رسالت کو اہمیت حاصل ہے اقبال نے دیگر کئی مذاہب کے

بنیادی عقائد، نظامِ عبادات اور اہم شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ کلامِ نانک بھی اسی نوع کے افکار سے لبریز ہے۔ مثلاً کلمۂ طیبہ یعنی توحید و رسالت مسلمانوں کے ایمان کی بنیاد ہے۔ اقبال کلمہ طیبہ کو خودی کا سرِّ نہاں کہتے ہیں اور اسے شخصیت کے استحکام کا ذریعہ جانتے ہیں:

خودی کا سرِّ نہاں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ خودی ہے تیغ، فساں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ(۱۲۰)

اقبال مسلمانوں کو اس کلمہ کو دل سے پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں(۱۲۱)

بابا گورو بھی کلمہ کو دین کا بنیادی رکن قرار دے کر ہر شخص کو اسے پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اسے شفاعت کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔

کلمہ یاد کر نفع اور کت بات نفس ہوائی رکن دین نہیں کیوں ہو نہ مات(۱۲۲)

ترجمہ: (رکن دین کلمہ طیبہ یاد کرتے رہو۔ اس سے بڑھ کر نفع مند کوئی بات نہیں حرص و ہوا کے پیچھے پڑنے سے انسان ماند پڑ جاتا ہے۔)

منہ تے کلمہ آکھ کے دوئی دروغ کمائے اگے محمد مصطفی سکے نہ تنہاں چھڑائے(۱۲۳)

ترجمہ: (جو کلمہ پڑھنے کے بعد بھی دروغ گوئی میں مبتلا رہیں گے۔ وہ قیامت کے دن محمد مصطفی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی شفاعت سے محروم رہیں گے۔)

اقبال کے نزدیک خدا ایک نفس کلی یا ''انا'' ہے۔ یہ ہستی تولد و تناسُل کے رجحان سے بالاتر ہے۔(۱۲۴) انھوں نے ''اسرار و رموز'' میں سورۃ اخلاص کی تفسیر منظوم کی ہے۔ وہ توحید کو سرمایہ روحانی اسرار اور افکار کی شیرازہ بندی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور دین و حکمت کو اُسی کا ثمر کہتے ہیں:

دیں ازو، حکمت ازو، آئیں ازو زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو(۱۲۵)

ترجمہ: (دین، حکمت، شریعت سب اسی (توحید) سے ہیں۔ اسی سے افراد و اقوام میں زور، قوت اور اثبات و استحکام جنم لیتا ہے۔)

بابا نانک نے کلام میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کو ''لَم یلِدَ وَلَم یُولَدَ'' سے ظاہر کیا ہے۔ کلام کا آغاز ہی توحید سے ہوتا

ہے،وہ کہتے ہیں

او نکار ست نام پُرکھ نربھور نرو پر اکال مورت اجونی سے بھنگ کر پرساد(۱۲۶)

ترجمہ: (خدا ایک ہے۔واحد،اُس کا نام سچّا ہے۔خالق کل ہے،عداوت سے باہر،لافانی سروپ، پیدا ہونے اور جون میں آنے سے پاک ہے۔گورو کی مہربانی۔)

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

صاحب میرا ایکو ہے ایکو ہے بھائی ایکو ہے

آپ مارے آپے چھوڑے آپے لیوے دے وِ(۱۲۷)

ترجمہ :(میرا خالق اور مالک ایک ہی ہے(ہاں) بھائی وہ ایک ہی ہے۔وہی مارنے والا اور زندہ کرنے والا ہے۔)

توحید پر اعتقاد مستحکم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ انبیا کرامؑ کو مبعوث فرماتا رہا ہے۔علامہ اقبال نے اپنے کلام میں نبوّت و رسالت کی اہمیت اور تعلیمات وثمرات کو بیان کیا ہے،وہ ''رموزِ بیخودی'' میں کہتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید و ز رسالت در تنِ ما جاں دمید

از رسالت در جہاں تکوینِ ما از رسالت دینِ ما آئینِ ما(۱۲۸)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے ہمارا(امتِ مسلمہ) پیکر تخلیق فرمایا اور رسالت سے ہمارے بدن میں جان پھونکی۔ رسالت ہی سے اس دُنیا میں ہمارا وجود قائم ہے۔رسالت سے ہی ہمارا دین اور ہمارا دستور(شریعت) ہے۔)

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں(۱۲۹)

حیرت ہے بابا نانک نے بھی اپنے کلام میں محبّتِ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر زور دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ آخرت میں نجات کا وسیلہ وہی ہیں:

ملاحتِ محمدی مکھ ہی آکھونت خاصہ بندہ سجیا سر متراں ہوں مت(۱۳۰)

ترجمہ: (نبی کریمؐ کے چہرہ مبارک کی ملاحت ہی ہمیشہ بیان کرتے رہو۔وہی خاص ہستی اس مذہب کی سردار بن کر آئی اور سرداری محبّت کی وجہ سے ہے۔)

اور سیٹی چھوٹے نانکا حضرت جہاں پناہ(۱۳۱)

ترجمہ: (اے نانک حضرت جہاں پناہ کے کہنے سے ہی نجات ملے گی۔)

علامہ اقبال نے اسلام کے ارکان کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ ارکانِ اسلام کو صرف عبادت کا طریقہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسے مسلمان کو بہت بڑے مقصد کے لیے تیار کرنے کا ذریعہ بھی خیال کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ان ارکان کے ذریعے مردِ مومن کے کردار میں پختگی اور قوت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق خلافت کے عظیم فرض سے عہدہ برآں ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔ (۱۳۲)

اسلام کے نظامِ عبادات میں نماز کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال نماز کو اظہارِ محبّت کا ذریعہ اور مومن کا جواہر اسلحہ قرار دیتے ہیں:

لا الٰہ باشد صدف گوھر نما قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز
درکفِ مسلم مثالِ خنجر است قاتلِ فحشا و بغی و منکر است(۱۳۳)

ترجمہ: (کلمہ طیبہ صدف ہے۔ نماز گوہر، مومن کے دل کے لیے نماز حج اصغر ہے۔ مسلمان کے ہاتھ میں خنجر کی طرح ہے یہ بے حیائی، سرکشی اور ناپسندیدہ کاموں کو ختم کرتی ہے۔)

ایک مقام پر گویا ہیں:

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام مرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب(۱۳۴)

بابا نانک بھی نماز کی اہمیت کے قائل ہیں۔ وہ اسے عزت اور لاج کا سبب گردانتے ہیں:

کرنی کعبہ سچ پیر کلمہ کرن نواج تسبی سائیں بھاوسی نانک رکھے لاج(۱۳۵)

ترجمہ: (اگر کعبے کا رخ کرنا ہے تو کلمے، عمل اور نماز کے بغیر اس کا سامنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ اسی نماز کا نتیجہ تسبیح ہے جو عزت بڑھاتی ہے اور لاج رکھتی ہے۔)

بابا نانک دیو جی نمازوں کی معنویت بیان کرتے ہوئے گویا ہیں:

پنج نوا جا وکھت پنج پنجا پنجے ناؤ پہلا سچ حلال دوءِ تیجا خیر خداءِ
چوتھی نیت راس من پنجوی صفت و ثناءِ کرنی کلمہ آکھ کے تا مسلمان سداءِ
نانک جیتے یار کوڑے کوڑی پاءِ(۱۳۶)

ترجمہ (نمازیں پانچ ہیں۔ پانچوں کے مختلف نام ہیں اور معنویت یہ ہے کہ پہلی نماز سچ ہے۔ دوسری حلال حرام کی تمیز ہے۔ تیسری پاکیزگی چوتھی اخلاص اور پانچویں اللہ تعالیٰ کی صفت وثنا۔ ان پانچوں نمازوں کی حقیقت اپنے اندر پیدا کرو۔ یہی ان کا مقصد ہے تم اعمال صالحہ ہی سے مسلمان بن سکتے ہو۔

ورنہ جھوٹی اور من مانی راہوں پر چل کر تو نانک صرف جھوٹی چیزیں ہی حاصل ہونگی۔ لیکن نانک ان نمازوں سے کم تر درجے کا انسان بھی اعلیٰ درجے کا مالک بن جاتا ہے۔)

روزے کا تصوّر کئی مذاہب میں ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس کا ذکر ارکانِ اسلام میں کیا ہے وہ اسے تن پروری کے قلعہ کا فاتح قرار دیتے ہیں:

روزہ برجوع و عطش شبخوں زند　　خیبر ِ تن پروری را بشکند(۱۳۷)

ترجمہ: (روز بھوک پیاس پر شب خون مارتا ہے اور تن پروری کے قلعہ کو توڑتا ہے۔)

بابا گورونانک اپنے کلام میں روزہ کو نفس کی تربیت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں:

مہر مسیت صدق مصلا حق حلال قرآں　　سرم سنت سیل روجاھوہ مسلمان(۱۳۸)

ترجمہ: (مسجد انسان کو محبّت کا سبق دیتی ہے اور مصلی صدق کی تلقین کرتا ہے اور حق حلال کا علم قرآن مجید دیتا ہے۔ سنتِ نبویؐ پر عمل کرنے سے انسان میں شرم وحیا پیدا ہوتی ہے اور روزہ انسان کو صبر کا سبق دیتا ہے۔)

علامہ اقبال مسلمان ہونے کو بہت بڑی اور بھاری ذمہ داری قرار دیتے ہیں۔ مسلمان کی حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چو می گویم مسلمانم، بلرزم　　کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را(۱۳۹)

ترجمہ: (جب میں خود کو مسلمان کہتا ہوں تو لرز کے رہ جاتا ہوں کہ میں یہ جانتا ہوں کہ لا الہ کہنے سے کس قدر مشکلات ہیں میں کو مٹانا، اللہ کی مرضی کے تابع رہنا، راضی برضا شخصیت اور کیفیت کا دوسرا نام مسلمان ہے۔)

گورونانک نے بھی مسلمان ہونا ایک بڑی بھاری ذمہ داری قرار دیا ہے:

مسلمان کہاون مشکل جان ہووے تان مسلماں کہاوے
اوّل اوّل دین کر مٹھا مشکل ماناں مال مساوے

ہوئے مسلم دین سہانے مرن جیون کا بھرم چکاوے
رب کی رضائے منے سر اوپر کرتا منے آپ گواوے گنوا اے مسلمان مال
تو نانک سرب جہاں، حرمت ہوئے نا مسلمان کہاوے(۱۴۰)

ترجمہ : (مسلمان کہلانا مشکل کام ہے اگر کوئی فی الحقیقت مسلمان ہو تو بے شک ایسا ہی کہلائے۔ اوّل شرط یہ ہے کہ اولیا اللہ کے صلح کل طریقہ کو دل و جان سے پسند کرے۔ خود پسندی اور غرور کو چھوڑ دے۔ حسبِ توفیق بلا توقع حصول معاوضہ دُنیا و عقبیٰ خلوص دل سے فی سبیل اللہ خیرات کرے۔ راہِ حق میں استقلال اور ثابت قدمی عمل میں لائے۔ زندگی کی خواہش اور موت کے خوف کو دل سے دور کرے۔ توہماتِ باطلہ سے پاک ہو۔ رضائے الٰہی پر راضی رہے۔ خدا کو حاضر ناظر جانے۔ خودی خویشی دور کرے۔ جملہ مخلوقات کو رحم و ہمدردی کی نظر سے دیکھے اور نیک سلوک کرے تو البتہ مسلمان کہلا سکتا ہے۔ یعنی مسلمان کہلانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔)

علامہ اقبال بھی اپنی شاعری میں ضرورتِ مرشد پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مردانِ خدا کی صحبت انسانیت کے حق میں نسیمِ صبح کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ اہلِ دُنیا پر حقائق کے انکشاف، ان کی روحانی تربیت و رہنمائی اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ اور مرشدِ کامل کی صحبت ہی سے دُنیا میں رونق اور رنگینی ہے۔ اگر یہ سلسلہ ختم کر دیا جائے تو باغِ معنی آن کی آن میں اپنی بہار کھو دے۔

دمِ عارف نسیمِ صبحدم ہے اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میّسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے(۱۴۱)

مقدّس مقامات:

سکھوں کی عبادت گاہ گوردوارہ کہلاتی ہے جس کے معنی گورو تک پہنچنے کا دوارہ (دروازہ) ہیں۔ گوردوارہ میں شری گورو گرنتھ کو اونچے مقام پر صد احترام کھول کر رکھا جاتا ہے اور قیمتی کپڑوں سے ڈھانپا جاتا ہے۔ اس عمل کو پرکاش یعنی روشن کرنا کہا جاتا ہے، مراد اس سے روحانی روشنی ہے۔ گوردوارہ میں کوئی پوجا نہیں ہوتی۔ صرف گورو گرنتھ (سکھوں کی مذہبی کتاب) کو احترام سے سجدہ کیا جاتا ہے اور سامنے ہتھیار رکھے جاتے ہیں۔ کرپان رکھے بغیر کوئی شخص سکھ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ سکھ اور ہتھیار لازم و ملزوم ہیں۔(۱۴۲)

اقبال نے ''اتحادی حکومت کی مثلث'' ایک نظم کہی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ انگریزوں

کی تابعداری میں برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے مختلف مذاہب کے لوگ کسی صورت بھی مذاہب پر آزادی سے عمل نہ کرسکیں گے۔ اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے انھوں نے سکھوں کی مذہبی عبادت گاہوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے سرکردہ افراد کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

کہا مَیں نے اے نکتہ رس اتحادی دوارا ہو، مکتب ہو یا پاٹھ شالا
کھلے گا اگر تو گورز کے ہاتھوں پڑا ہے غلامی کا ان سب پہ تالا
گلے میں اٹک جائے گا بن کے کانٹا وزرات کا عہدہ نہیں تر نوالا(۱۴۳)

یعنی اقبال نے ایک نکتہ رس اتحادی کو یہ بات سمجھائی ہے کہ گورنر کا کہنا ماننے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم آزادانہ عبادت نہ کرسکیں گے۔ اس لیے کہ ہم انگریزوں کے غلام ہیں۔ وزارت کا عہدہ آسان نہیں ہے۔ وزارت کے عہدہ پر متمکن رہنا بہت مشکل ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنا آسان نہیں۔

سکھ شخصیات:

کلامِ اقبال میں صرف ایک سکھ شخصیت پر نظم ملتی ہے جس کا جائزہ درج ذیل ہے۔

جوگندر سنگھ:

جوگندر سنگھ اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ یوسف سلیم چشتی ''شرح بانگِ درا'' میں لکھتے ہیں:

''سکھوں میں صرف دو آدمی ایسے گزرے ہیں جو اقبال کے کلام کے شیدائی تھے۔ ایک تو یہی جوگندر سنگھ، دوسرے امراؤ سنگھ گل جو فرانس میں رہا کرتے تھے''۔(۱۴۴) علامہ اقبال نے نظم ''موٹر'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔ نواب ذوالفقار علی خاں نے ایک مرتبہ نہایت بیش قیمت موٹر خریدی۔ اس زمانے کی عام موٹریں چلتی تھیں تو ان کے انجنوں میں شور بہت ہوتا تھا۔ نواب صاحب کی موٹر اس شور سے بالکل پاک تھی۔ ایک مرتبہ نواب صاحب، سر جوگندر سنگھ، اقبال اور میرزا جلال الدین اس میں بیٹھ کر شالا مار کی سیر کو نکلے۔ راستے میں سر جوگندر سنگھ نے از راہِ حیرت کہا کہ نواب صاحب کی موٹر کس قدر خاموش واقع ہوئی ہے۔ بس یہی ایک کلمہ اقبال کے لیے نظم کا بہانہ بن گیا۔(۱۴۵) مرزا جلال الدین فرماتے ہیں ''بظاہر یہ بات کوئی ایسے پتے کی نہ تھی کہ اقبال اس سے یوں متاثر ہو جاتے اور اسی فقرے پر اپنی نظم کی بنیاد رکھ دیتے'' لیکن ہوا یہی کہ اقبال کی حکیمانہ طبیعت نے اسی سے نہایت عمدہ مضامین پیدا کر لیے۔''(۱۴۶)

نظم ملاحظہ کیجیے:

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی　　موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز　　مانندِ برق تیز، مثالِ ہوا خموش
میں نے کہا ، نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر　　ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش
ہے پاشکستہ شیوۂ فریاد سے جرس　　نکہت کا کارواں ہے مثالِ صبا خموش
مینا مدام شورشِ قُلقُل ہے پابہ گِل　　لیکن مزاجِ جامِ خرام آشنا خموش
شاعر کے فکر کو پرِ پرواز خامشی　　سرمایہ دار گرمی آواز خامشی (۱۴۷)

یعنی کل جوگندر نے کیسی پتے کی بات کر دی کہ ذوالقار علی خاں کا موٹر کس قدر خاموش ہے۔اس کے چلنے سے کوئی شور نہیں اٹھتا۔ یہ بجلی کی طرح تیز ہے۔ہوا کی طرح خاموش ہے۔میں نے کہا یہ موٹر ہی پر موقوف نہیں، زندگی کے راستے میں ہر تیز چلنے والا خاموش ہے۔گھنٹی شور و فریاد کی وادی ہے۔اس لیے اس کے پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں اور چل نہیں سکتی۔خوشبو کا قافلہ ہر طرف چل نکلتا ہے اور وہ صبا کی طرح خاموش ہوتا ہے شراب کی صراحی قلقل کا شور مچاتی ہے۔اس لیے اپنی جگہ ٹھہری رہتی ہے اور ادھر اُدھر نہیں پھر سکتی،لیکن پیالہ گردش میں رہتا ہے اور اس کی طبیعت خاموش ہے۔اس سے کوئی صدا بلند نہیں ہوتی۔شاعر کو دیکھو کہ اس کے تخیل کے لیے خاموشی اڑنے والے پر بن جاتی ہے اور خاموشی ہی کے باعث اس کی آواز میں گرمی،حرارت اور تاثیر پیدا جاتی ہے۔گویا خاموشی ہی گرمی آواز کا سرمایہ ہے۔(۱۴۸)

سید مظفر حسین برنی اپنی کتاب ''اقبال اور قومی یک جہتی'' میں لکھتے ہیں:

''سر جوگندر سنگھ نے ذوالفقار علی خاں کے موٹر کے بارے میں جو اتفاقیہ طور پر ایک جملہ کہا تھا،اسے نظم کر کے تو اقبال نے انھیں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔'' (۱۴۹)

اقبال نے جوگندر سنگھ کی ایک عام سی بات سے شاعرانہ نکتہ آفرینی کی ہے اور اس نظم کو منتخب کلام کا حصہ بنا کر جگندر سنگھ سے دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

حوالہ جات

(۱) سید افضل حیدر، بابا نانک، اسلام آباد : دوست پبلی کیشنز، 2005ء، ص14:

(۲) سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم، لاہور : مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، 1998ء، ص84:

(3) W.O Cole and P.S Sambhi,A popular Dictionary of Sikhism, London: Appendix Glenn Dale, Riverdale,Curzon Press,1990,p:5

(۴) محمد اقبال، سکھ، اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 11 :، لاہور : دانش گاہِ پنجاب، 1975ء، ص108:

(۵) ایضاً

(6)Sher Singh,Phlosophy of Sikhism, Sri Amritsar, Shiromani Gurdawara parb and hlak Community,4 Ed,1998,P:29

(۷) نانک سنگھ نشتر، شری گرو گرنتھ صاحب، انڈیا، دہلی : انٹرنیشنل سکھ سنٹر فار انٹر فیتھ ریلیشنس، 2007ء، ص16:

(۸) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، عروجِ اقبال، لاہور : بزم اقبال، 1987ء، ص16:

(۹) عبدالکریم قاسم، علامہ اقبال کے اساتذہ، اسلام آباد : ہائر ایجوکیشن کمیشن، 2006ء، ص36:

(۱۰) ایضاً (۱۱) ایضاً (۱۱) ایضاً

(۱۳) فقیر سید وحیدالدین، روزگارِ فقیر، جلد اوّل، لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت، 1987ء، ص134:

(۱۴) عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، لاہور : بزم اقبال، 1983ء، ص66:

(۱۵) محمد صدیق علامہ اقبال اور ان کے بعض احباب، لاہور : بزم اقبال، 1988ء، ص118:-115

(۱۶) ڈاکٹر محمد دین تاثیر، مضمون اسما الرجال اقبال میں، مشمولہ اقبالیاتِ تاثیر، (مرتب) ، افضل حق قریشی، لاہور : اقبال اکادمی پاکستان، 2010ء، ص33:

(۱۷) محمد صدیق، علامہ اقبال اور ان کے بعض احباب، ص ۱۱۹:

(۱۸) ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، علامہ کے چند غیر مسلم احباب،، ہفت روزہ، لاہور 19: مارچ 1978ء، ص10: بحوالہ کتاب مذکورہ بالا

(۱۹) محمد صدیق، علامہ اقبال اور ان کے بعض احباب، ص120:

(۲۰) ایضاً

(۲۱) مرزا جلال الدین، مضمون میرا اقبال مشمولہ، ملفوظاتِ اقبال، (مرتب) ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 1977ء، ص83:

(۲۲)فقیر سیّد وحید الدین، روز گارِ فقیر، جلد اوّل ص 120 :121،

(۲۳)عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال ص 15:

(۲۴)میاں محمد شفیع ،اقبال کے شب و روز،مشمولہ، علامہ اقبال اپنوں کی نظر میں،(مرتّب) ،مصباح الحق صدیقی، لاہور: فرحان پبلشرز ،1977ء ص 134:

(۲۵)عبدالمجید سالک، ذکر اقبال ص 220:

(۲۶)فقیر سیّد وحید الدین، روز گارِ فقیر، جلد دوم،لاہور : مکتبہ تعمیر انسانیت ص 201 :202،

(۲۷)عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال ص 81,80:

(۲۸)سلیم خاں گمی، نانک،مشمولہ، اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد 22: ص 57:

(29)Marian W. Smith, Sikhs, The Encyclopeadia Americana, Vol:24, U.S.A: Grolier Incorporated,15th edition, 1972, P:808

(۳۰)سیّد محمد لطیف، تاریخِ پنجاب،لاہور : گوہر پبلی کیشنز، س۔ن ص 54:

(۳۱)بھائی گیان سنگھ جی گیانی، تواریخِ گوروخالصہ، جلد اوّل، امرتسر: بوہارک ایجنسی طبع سوم،1913ء ص 29:

(۳۲)ملک راج بھلہ، نانک چرتر، شہر ندارد: سمت بکر ما جیتی طبع دوم،1962 ص 110:

(۳۳)میاں امام علی قادری، (خلیفہ مجاز) سوانح حضرت سید ابوالخیر نولکھ ہزاری فیصل آباد : مقام اشاعت ندارد 1987ء, ص 13:

(۳۴)بھائی بالا،(مترّجم)،سب توں وڈی جنم ساکھی گورونانک دیوجی (اُردو) مصنف، بھائی دیارام عاکف، لاہور : سردار جوت سنگھ پبلشرز، تاجرانِ کتب،1911ء ص 6 :7،

(۳۵)ایضاً ص 7:

(۳۶)ایضاً ص 8:

(۳۷)لالہ دیارام، گرونانک دیوجی کی سوانح عمری، لاہور :لالہ رام بک سیلرز،1919ء ص 8:

(۳۸)محمد اقبال،''سکھ''،مشمولہ، اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 11: ص 108:

(۳۹)بھائی گیان سنگھ جی گیانی، تواریخِ گوروخالصہ، جلد اوّل ص 31:

(۴۰)پروفیسر ڈاکٹر جہانگیر تمیمی، بابا گورونانک، لاہور :سنٹر برائے ساؤتھ ایشین سٹڈیز، پنجاب یونی ورسٹی، قائداعظم کیمپس ،2014ء ص 69:

(۴۱)بھائی گیان سنگھ گیانی، تواریخِ گوروخالصہ، حصّہ اوّل ص 24 :25،

(۴۲)محمد اقبال، سکھ،مشمولہ اُردو معارفِ اسلامیہ، جلد 11: ص 108:

(۴۳)ہربنس سنگھ، گورونانک، سوانح عمری، لاہور : نگارشات 2011ء ص 119 :-115

(۴۴)ملک راج بھلہ، نانک چرتر ص 89:

(۴۵)لالہ دیارام عاکف،گورونانک دیوجی کی سوانح عمری،ص27:

(۴۶)سلیم خاں گمی،نانک،ص77:

(۴۷)صوفی غلام قاسم،شیخ عبدالکریم،تذکرہ بابانانک،امرتسر :روز بازار پریس،1346ھ،ص4:

(۴۸)کنہیالال،تاریخ پنجاب،لاہور :مشتاق بک کارنر،2002ء،ص18:

(۴۹)ڈاکٹر صابر کلوروی(مرتب)،کلیات باقیاتِ شعرِ اقبال،ص194:

(۵۰)باباگورونانک،کلام نانک،گوروگرنتھ صاحب،لاہور :جپ محکمہ السنہ پاکستان،2001ء،ص73:

(۵۱)ایضاً،بشریٰ گوروگرنتھ میں 6000 شبد ہیں۔اس میں موجود کلام کو ہندوستانی موسیقی کے مطابق راگوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۵۲)باباگورونانک،کلامِ نانک،گوروگرنتھ،مارو محلا،دکھنی،ص789:

(۵۳) ایضاً،گوروگرنتھ،سورٹھ محلا۔اص295:

(۵۴) ایضاً،کلام نانک،سورٹھ محلا۔اص495:

(۵۵) ایضاً،جپ جی،ص75:

(۵۶) ایضاً،پوڑی16:،ص81:

(۵۷) ایضاً،پوڑی35 :،36،ص95:

(۵۸)ایضاً،پوڑی38:،ص97:

(۵۹) ایضاً،راگ گوڑی گوارے،ص229:

(۶۰)ایضاً،جپ جی اور سکھمنی صاحب،ص82:

(۶۱)ایضاً،راگ دھناسری محلا۔اص105:

(۶۲)ایضاً،کلام نانک،راگ تلنگ محلا۔اگھر۔اص537:

(۶۳)ایضاً،سورٹھ محلا۔اص497:

(۶۴)ایضاً،گوروگرنتھ راگ ملہار،محلا3:،ص1212،1214

(۶۵)بھائی ویرسنگھ،پراتن جنم ساکھی(ولایت والی)امرتسر :مقام اشاعت ندارد،1604ء،ص226:

(۶۶) ایضاً،ص250:

(۶۷)ملک رام لعل حکیم خاذق،یونیورسل ریلجن یاعالمگیر مذہب،گوروگرنتھ نانک،ملتان :سکھ سبھا(رجسٹرڈ)نواں شہر1933ء،ص3:

(۶۸)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال،بانگِ درا،کلیاتِ اقبال اُردو،ص113:

(۶۹)مولوی عبدالکریم صاحب بی۔اے،تواریخِ ہندوی،کلکتہ :اورینٹل پرنٹرز پبلشرز لمیٹڈ،طبع یازدہم،1923ء،ص163:

(۷۰)بھائی گیان سنگھ جی گیانی،تواریخِ گوروخالصہ،جلداوّل،ص29:

(۷۱)ابوریحان البیرونی،ہندودھرم۔ہزار برس پہلے،لاہور :نگارشات پبلشرز،2007ء،ص92-89

(۷۲)باباگورونانک،گوروگرنتھ،سلوک محلا۔اص293:

(۷۳)ایضاً،سلوک محلا۔اص189

(۷۴)عباداللہ گیانی،ہمارانانک،ص18:

(۷۵)بھائی بالا،تواریخِ گوروخالصہ،جلداوّل،ص71:ومابعد

(۷۶)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال،بانگِ درا،کلیاتِ اقبال اُردو،ص269:

(۷۷)فقیر سیدوحیدالدین،روزگارِ فقیر،جلد دوم،ص338:

(٧٨) بھائی گیان سنگھ گیانی، تواریخِ گوروخالصہ، حصہ اوّل،ص28: ،29

(٧٩) لالہ دیارام، گرونانک دیوجی کی سوانح عمری، تفصیل کے لیے دیکھیے،ص45: -37

(٨٠) تفصیل کے لیے دیکھیے، تواریخِ گوروخالصہ،ص40: -30

(٨١) ایضاً، تفصیل کے لیے دیکھیے،ص47: -40 (٨٢) ایضاً، تفصیل کے لیے دیکھیے،ص52: -48

(٨٣) سلیم خاں گمی، نانک،ص78:

(٨٤) تفصیل کے لیے دیکھیے، تواریخِ گوروخالصہ، جلداوّل،ص51: ،52

(٨٥) بھائی بالا ،(مترّجم)، باباگورونانک سب توں وڈی ساکھی گورونانک دیوجی،ص145:

(٨٦) کیخسر واسفندیار، دبستانِ مذاہب،(فارسی)، بمبئی :درمطبع نامی نول کشور،1881ء،ص223:

(٨٧) بھائی بالا، تواریخِ گوروخالصہ، جلداوّل،ص54: (٨٨) ایضاً،ص55،56

(٨٩) لچھمن سنگھ، جنم ساکھی کلاں گورونانک، امرتسر :پریس، بازارمائی سیواں،1958ء،ص188:

(٩٠) شیخ محمد یوسف، بابانانک کا مذہب، شہرندارد، گلزار سٹیم پریس1919ء،ص131:

بھائی گیان سنگھ گیانی نے تواریخِ گوروخالصہ، جلداوّل میں صفحہ 58 پر لکھا ہے کہ بغداد کے خلیفہ نے انھیں ایک جامہ جس پر کئی زبانوں میں قرآن شریف، زبور وغیرہ کی آیتیں منقش تھیں، نذرکیا جو کہ اب تک ڈیرہ بابانانک میں موجود ہے۔ ہولا کے میلہ پر اس کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ یہ پیراہن کابلا سنگھ بندی کے پاس ہے۔

(٩١) ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال، فارسی،ص322:

(٩٢) تفصیل کے لیے دیکھیے، تواریخِ گوروخالصہ، جلداوّل،ص23: -70

(٩٣) محمد اقبال، سکھ مشمولہ، اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد11: ،ص109:

(٩٤) بھائی بالا، تواریخِ گوروخالصہ، جلداوّل،79 ص80:

(٩٥) ایضاً،ص84: (٩٦) ایضاً،ص85: (٩٧) ایضاً،ص88: ،89

(٩٨) ملک راج بھلہ، نانک چرتر،ص177: (٩٩) ایضاً،ص88:

(١٠٠) ایضاً،ص92: (١٠١) ایضاً،99،100 (١٠٢) ایضاً،ص79،80

(١٠٣) ایضاً،ص104: ،107 (١٠٤) ایضاً،ص108: (١٠٥) ایضاً،ص136:

(١٠٦) محمد اقبال، سکھ، مشمولہ، اُردو معارفِ اسلامیہ، جلد11: ،ص112:

(١٠٧) ابوطاہر محمد صدیق، مذاہبِ عالم کا انسائیکلوپیڈیا، کراچی :ادارۃ القرآن،2001ء،ص249:

(١٠٨) سیدافضل حیدر، بابانانک، لاہور :دوست پبلی کیشنز،2005ء،ص34:

(١٠٩) بھائی بالا، تواریخِ گوروخالصہ، جلداوّل، تفصیل کے لیے دیکھیے،ص227: -164

(۱۱۰)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص745:

(۱۱۱)پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی، بابا گورونانک، ص142:

(۱۱۲)ڈاکٹر صابر کلوروی، (مرتّب)، کلیات باقیاتِ شعرِ اقبال، ص456: 457،

(۱۱۳)ایضاً، ص423:

(۱۱۴)سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، لاہور : اقبال اکادمی پاکستان، طبع سوم، 2000ء، ص427: 428،

(۱۱۵)ایضاً، ص124: 120-

(۱۱۶)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مسافر، ص817:

(۱۱۷)پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی، بابا گورونانک، ص3:

(۱۱۸)کنہیا لال، تاریخِ پنجاب، لاہور : مشتاق بک کارنر، 2002ء، ص18:

(۱۱۹)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اُردو، ص304:

(۱۲۰)ایضاً، ضربِ کلیم، ص527: (۱۲۱)ایضاً، ص547:

(۱۲۲)بھائی بالا، (مترجم)، جنم ساکھی گورونانک دیو جی، ص221:

(۱۲۳)ایضاً، ص153

(۱۲۴)سید نذیر نیازی، (مترجم)، تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص116:

(۱۲۵)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، اسرارِ خودی، کلیاتِ اقبال فارسی، ص91:

(۱۲۶)بابا گورونانک، کلامِ نانک، ص73: (۱۲۷)ایضاً، ص295:

(۱۲۸)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، رموزِ بیخودی، کلیاتِ اقبال فارسی، ص102:

(۱۲۹)ڈاکٹر علامہ محمد، اقبال، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال، اُردو، ص237:

(۱۳۰)بھائی ویر سنگھ، پراتن جنم ساکھی، (ولایت والی)، امرتسر : مقامِ اشاعت ندارد، 1604ء، ص226:

(۱۳۱)ایضاً، ص250:

(۱۳۲)پروفیسر شفیق الرحمن ہاشمی، اقبال کا تصورِ دین، ص7:

(۱۳۳)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، اسرارِ خودی، کلیاتِ اقبال فارسی، ص43:

(۱۳۴)ایضاً، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اُردو، ص441:

(۱۳۵)بابا گورنانک، کلامِ نانک، راگ باجھ، سلوک، محلہ 1: ص203:

(۱۳۶)کلامِ نانک، وار ماجھ سلوک محلہ 1، ص203:

(۱۳۷)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، اسرارِ خودی، کلیاتِ اقبال فارسی، ص43:

(۱۳۸)باباگورونانک،کلامِ نانک،راگ سلوک،محلہ1،ص189:
(۱۳۹)ڈاکٹرعلامہ محمداقبال ارمغانِ حجاز فارسی،کلیاتِ اقبال فارسی،ص941:
(۱۴۰)باباگورونانک،جپ جی(اُردو)سندرگٹکامع شبد ہزارے،امرتسر:بھائی جیون سنگھ،بھائی چتر سنگھ،باز ارمائی سیواں،س۔ن،ص2:
(۱۴۱)ڈاکٹرعلامہ محمداقبال،بالِ جبریل،کلیاتِ اقبال اُردو،ص413:
(۱۴۲)نانک سنگھ نشتر،شری گروگرنتھ صاحب انڈیا:انٹرنیشنل سکھ سنٹر فار رائٹر فیتھ ریلیشنس،2007ء،ص14:
(۱۴۳)ڈاکٹرصابرکلوروی،(مرتّب)،کلیات باقیاتِ شعرِ اقبال،ص457:،458
(۱۴۴)یوسف سلیم چشتی،شرحِ بانگِ درا،ص333:
(۱۴۵)مولاناغلام رسول مہر،مطالب بانگِ درا،ص227:
(۱۴۶)مرزاجلال الدین،ملفوظاتِ اقبال،ص146:
(۱۴۷)ڈاکٹرعلامہ محمداقبال،بانگِ درا،کلیاتِ اقبال اُردو،ص206:
(۱۴۸)مولاناغلام رسول مہر،مطالب بانگِ درا،ص227:،228
(۱۴۹)سیدمظفرحسین برنی،اقبال اورقومی یک جہتی،چندی گڑھ:ہریانہ ساہتیہ اکادمی،1984ء،ص43:

***

سیالکوٹ میں فارسی ادب کے چند درخشندہ ستارے

☆ڈاکٹر اکبر علی غازی ☆☆ڈاکٹر افتخار احمد سلہری ☆☆☆ ڈاکٹر سونیا اللہ رکھا

A few shining stars of Persian literature in Sialkot,

A central District of Punjabi Language

Dr.Akbar Ali Ghazi/ Dr.Iftikhar Ahmad Sulehri / Dr.Sonia Allah Rakha

Sialkot has been a prominent place in knowledge and literature in known history of the glorious days.Region had a central position even before the arrival of Islam, but Raja Salbhan ruled sitting in his own territory. In different periods of history, every skill and expert of knowledge and art continued to be born here.After the advent of Islam, the people of this region accepted the message of truth with a rather delicate enthusiasm. Along with the languages of the foreign invaders, the local language Punjabi also continued to exist .

Punjabis not only accepted Islam with open heart but also played an important role in its promotion. The fame of madrasas and local and non-local scholars of this land spread far and wide. There were many centers of knowledge and grace, whose fame had reached foreign countries.In this article an introduction and sample of some such poets and

writers has been presented who were Punjabi but they served the Persian language and literature.

برصغیر پر ایک ایسا وقت بھی تھا جب یہ علاقہ (جموں کشمیر و پنجاب) فارسی زبان و ادب کا مرکز بن چکا تھا۔ راجہ رنجیت سنگھ جس نے پنجاب کی حدود کو شمالی علاقہ جات تک وسعت دے دی تھی کے دور میں فارسی سلطنت کی سرکاری زبان قرار پائی۔ اس دور میں اردو اور پنجابی بھی ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہیں مگر فارسی کو اولیت حاصل تھی۔ قیام پاکستان سے تقریباً ایک سو سال پہلے تک فارسی پاکستان کے بیشتر علاقوں کی سرکاری زبان تھی۔ انگریزوں نے قبضہ جمانے کے بعد اس کا زور توڑنے کی شعوری کوششیں کیں۔ پہلے مرحلے پر اردو کی حوصلہ افزائی کی اور پھر اپنی زبان کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کر دیا۔ سکھوں کے آخری دور تک کئی سو سال تک یہاں کی سرکاری زبان فارسی رہی۔ اس کے اثرات آج بھی اردو اور پاکستانی زبانوں پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے یہاں فارسی زبان اور ادبیات کا دور دورہ بھی رہا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب یہاں (مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پنجاب میں) فارسی ادبیات کی مقبولیت ایران سے بھی بڑھ چکی تھی۔ اس عروج کے بعد فارسی کو زوال کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ بہت تیزی کے ساتھ اس کی جگہ انگریزی اور اردو نے لے لی۔ اب ہمارے ہاں انگریزی اور اردو کا سکہ چلتا ہے مگر ماضی بعید اور ماضی قریب میں فارسی ادبیات کا چلن شاندار تھا۔

معلوم تاریخ کے شاندار ادوار میں سیالکوٹ کو علم و ادب میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ علاقے کو اسلام کی آمد سے قبل بھی مرکزیت حاصل تھی بلکہ راجہ سالبھان جیسے وسیع خطے کے حاکم نے بھی اسی اپنے علاقے میں بیٹھ کر حکومت کی۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہاں حرب وضرب اور علم فن کے ماہر پیدا ہوتے رہے۔ اسلام کے آنے کے بعد اس علاقے کے ذی فہم لوگوں نے حق کے پیغام کو نسبتاً ذوق وشوق سے قبول کیا۔ باہر سے آنے والے حملہ آوروں کی زبانوں کے ساتھ ساتھ مقامی زبان پنجابی بھی پنپتی رہی۔

پنجابیوں نے نہ صرف اسلام کو کھلے دل سے قبول کیا بلکہ اس کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس دھرتی کے مدرسوں اور مقامی اور غیر مقامی علماء کرام کی شہرت دور دور تک پھلی ہوئی تھی۔ یہاں علم وفضل کے کئی مراکز قائم تھے جن کی شہرت بیرونی ممالک تک پہنچ چکی تھی۔

ذیل میں اس ضلع کے چند شعراء و ادباء کا تعارف اور نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے جو تھے تو پنجابی مگر انھوں نے فارسی زبان و

ادب کی خدمت بھی کی۔اس حوالے سے سب سے بڑا نام علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ہے جنھیں اہل ایران اقبال لاہوری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔اس مختصر مضمون میں علاقے کے تمام فارسی شعراء کا احاطہ ممکن نہیں تھا اس لیے چند غیر معروف شعراء کے تعارف اور نمونہ کلام تک محدود رہا گیا ہے البتہ روایت کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے چند معروف شعراء کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

میر محمد رائج سیالکوٹی (۱۱۰۰ھ)

میر محمد رائج سیالکوٹی سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔اپنے والد میر دوست محمد صانع سے اکتساب علوم کیا۔وطن میں چند دیہات کے مالک تھے۔بڑے آزاد مشرب اور خوش صحبت انسان تھے۔ناصر علی سرہندی، میرزا بیدل، شاہ فقیر اللہ آفرین اور دیگر معاصر شعراء کے ہم طرح تھے۔پختہ مشق شاعر تھے اور صاحب فکر و معنی بلند(۱)۔

سادات سیالکوٹ کے ایک نامور خاندان سے تھے۔''سرو آزاد'' میں آپ سے متعلق مولانا آزاد بلگرامی مرحوم نے چند سطور لکھی ہیں۔انہی میں سے چند الفاظ یہاں لکھے جاتے ہیں:

''آزاد مشرب خوش خلق اور خوش صحبت تھے۔قلندرانہ طور پر رہتے تھے۔بزم سخن ہمیشہ گرم رکھتے اور لوگوں کو اپنے کلام سے مستفیض کیا کرتے۔1100ھ میں بہ زمانہ عالمگیر طویل عمر پا کر مرحلہ زندگانی کو طے کیا'' (۲)۔۱۱۰۰ھ کو سن عیسویں میں تبدیل کیا جائے تو 1689ء بنتی ہے۔

مولانا موصوف لکھتے ہیں:

''میں جب ۱۱۴۷ھ میں سفر سندھ سے واپس ہوتا ہوا لاہور آیا۔تو ایک عزیز جو میر رائج کا صحبت یافتہ تھا۔میرے آنے کی خبر سُن کر مجھ سے ملنے آیا اور اُسی نے مجھے میر رائج کے کچھ شعر سنائے۔بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ صاحب دیوان شاعر ہیں''۔اُن اشعار میں سے تین یہاں درج کیے جاتے ہیں:

روز وصل از بیم هجراں توام گریاں گذشت
آه عید آمد پس از عمرے و درباراں گذشت
چه ساں آموقت بے رحمانه بر فتراک سر بستن
ز طفلی آں شکار افگن نمے داند کمر بستن
اگر باحق نیازی هست حاجت نیست شمیری
ستون و سقف درویشاں همیں دستِ دعا باشد(۳)

سیالکوٹی مل وارستہ (ف ۱۷۶۶ء)

نام سیالکوٹی مل اور تخلص وارستہ تھا۔اس قلمکار، سیالکوٹی جن کے نام کا حصہ ہے کو لاہوری بھی بتایا جاتا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔۔شاعری میں میر محمد رائج سیالکوٹی (متوفیٰ ۱۷۳۷ء) کے شاگرد تھے۔ایک شاعر کی حیثیت ان کا ذکر کئی تذکروں میں کیا گیا اے۔وہ بارہ سے پندرہ سال فارسی زبان کے جدید محاورے اور اصطلاحات کے مطالعہ کے لیے ایران میں سرگرداں رہے۔آخری عمر میں ڈیرہ غازی خان چلے گئے تھے جہاں ۱۷۶۶ء میں فوت ہوئے۔ان کی مندرجہ ذیل کتب کا ذکر ملتا ہے:

ا۔مصطلحات الشعراء، ۲۔مطلع السعدین، ۳۔صفاتِ کائنات، یا، عجائب وغرائب، ۴۔جوابِ شافی، یا، رجیم الشیاطین، جنگ رنگا رنگ (تذکرہ وارستہ)

تاریخ ادبیات پاکستان مسلمانانِ پاکستان وھند کی پانچویں جلد، فارسی ادب (سوم) میں ان کی پہلی کتاب کے حوالے سے تفصیل سے بات کی گئی ہے۔فاضل محقق نے ان کی شاعری کو تو قابل توجہ نہیں سمجھا مگر زبان اور ادب کے حوالے سے کتابوں کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ بتایا ہے کہ یہ کتابیں بعد کی تحقیق میں نقل کی گئیں۔بہت سے محققین نے ان کو مکمل طور پر بھی اپنی کتب میں استعمال کیا(۴)۔

دل محمد دلشاد پسروری (۱۸۰۰ء)

دِل محمد تخلص دلشاد کرتے تھے۔۱۸۰۰ء کے آغاز میں حکیم غلام رسول کے ہاں گلی حکیماں والی محلہ سیداں پسرور میں پیدا ہوئے۔علم حکمت، منطق، فقہ، سلوک، اخلاص اور شعری علم میں کمال حاصل تھا۔ان کا ایک فارسی شعر ہے:

از علم شعر و منطق فِقہ و سلوک و اخلاص
دارد تمام لیکن دلشاد زر نہ داد(۵)

حکمت ان کا پیشہ تھا۔فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ان کا افارسی دیوان ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور کی طرف سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔حافظ محمود شیرانی نے اپنی مشہور تالیف ''پنجاب میں اردو'' میں ان کا اردو کلام بھی نقل کیا ہے(۶)۔پسرور کے مولانا نور احمد امرتسری ان کی نسل سے ہیں۔ان کی مندرجہ ذیل کتب کا سراغ ملتا ہے:

ا۔خلاصتہ التواریخ (فارسی)

خلاصتہ التواریخ فارسی زبان میں ہے۔دل محمد دلشاد نے یہ کتاب ۱۱۸۲ ہجری میں دو سال کا عرصہ لگا کر لکھی

تھی۔اس کا قلمی نسخہ ڈاکٹر محمد باقر کے ذاتی کتب خانے میں تھا۔انھوں نے اپنی ایک طالبہ بشریٰ شفیع سے اس پر ایم اے فارسی کا ایک مقالہ ۱۹۶۷ء میں لکھوایا جس میں اس کتاب کے بہت سے پہلو سامنے لائے جا چکے ہیں۔دل محمد دلشاد کے پوتے عمر بخش نے ۱۱ کاتک ۱۸۸۰ بکرمی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کے صرف دو صفحات محمد اکبر بن منشی نور حسین حال مقیم راجگڑھ لاہور کے پاس دیکھے گئے۔یہ اوراق حکمت کی ایک کتاب کے ہیں جس کا سائز ۱۹X۳۴ سم ہے۔ہر صفحے پر ۲۳ سطور ہیں۔یہ نسخہ فارسی زبان میں ہے۔ان دو صفحات پر دل محمد دلشاد کا شجرہ بھی لکھا ہوا ہے(۷)۔

دل محمد دلشاد کے کلام میں جگہ جگہ پسرور شہر کی تاریخ اور آثار کا بیان ملتا ہے۔تاریخ پسرور میں ان کے فارسی اشعار سے بہت سے مقامات پر بنیادی مآخذ کا کام لیا گیا ہے۔ایک تالاب کا ذکر شاعر نے یوں کیا ہے:

یکی در دست عجب تال آب، شش پہلو
بشش جہات، بہ پنجاب، کو کہ ثانی آنست(۸)

پُرسرور (پسرور) کو حکیم دل محمد دلشاد صاحب اس نظر سے بھی دیکھتے تھے:

شہرِ ما پُرسرُور می گویند کانِ علم و شعور می گویند
بے تکلّف ، سواد آبادش تالبِ آبِ شور می گویند
اہلِ اخبارِ ہند تاریخش اوّل از لاہور می گویند
شُکرِ فیاضی دو تالابش مردم و مُرغ و مور می گویند
حسن ہر خانہ ایش ہخی سیفند شہرِ حُور و قصور می گویند
برمزارِ امامِ برخوردار طُرفہ بزمِ حضور می گویند
خاکِ دروازہ اش ہمی بنید سُرمۂ کوہِ طور می گویند
زِیں ولایت کُجا رَدَم دِلشاد شہرِ دھلی است دُور می گویند(۹)

مولانا نور احمد (۱۸۵۰ تا ۱۹۳۰ء)

اصل نام نور احمد ولد شہاب الدین ۱۸۵۰ء میں پسرور شہر میں پیدا ہوئے۔ورنیکلر مڈل سکول پسرور سے مڈل تک رسمی تعلیم حاصل کی ہوئی تھی اور درس نظامی بھی کیا ہوا تھا۔مشہور اساتذہ مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا فضل الرحمن مراد آبادی اور مولانا امداد اللہ سے دینی علم حاصل کیا۔ ۱۸۸۱ میں حجاز گئے۔جہاں مدرسہ صولتیہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی

سے علم حاصل کیا۔ آپ کی قابلیت دیکھ کر مولانا موصوف نے انہیں اپنے مدرسہ میں مدرس مقرر کر دیا۔ وہاں آٹھ سال پڑھاتے رہے۔ امداد اللہ مہاجر مکی کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ کئی مدارس قائم کیے۔ ۴ جنوری ۱۹۳۰ء کو آپ فوت ہوئے اور مسجد کے صحن میں آپ کو دفن کیا گیا۔ پنجابی، اردو، عربی اور فارسی پر دسترس تھی۔ عربی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ذیل میں ان کی کتب کی فہرست پیش ہے:

۱۔ شرح وحواشی مکتوبات امام ربانی (نو جلدیں)، مطبوعہ، مجدد امرتسر، ۱۳۲۷ھ

۲۔ مبداء ومعاد، حضرت مجدد الف ثانی کے رسالے کی تصحیح وتشریح، ۱۳۳۰ھ

۳۔ مکتوبات خواجہ محمد معصوم، جلد چہارم

۴۔ التنقید علی ورثتہ المفید، یتیم پوتوں کی وراثت پر ایک محققانہ نظر، مطبوعہ، وزیر ہند پریس امرتسر، ۱۸ جولائی، ۱۹۱۷ء

۵۔ شمائل ترمذی، ترمذی شریف کا ترجمہ، مطبوعہ، ۱۹۲۶ء

۶۔ ہدایۃ الطالبین، حضرت شاہ ابوسعید دہلوی نقشبندی کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ، مطبوعہ، ۱۹۲۶ء، صفحات ۱۰۸

۷۔ ملفوظات مرزا مظہر جان جاناں، الفیض میں بالاقساط شائع ہوتے رہے۔ پہلی قسط، ۱۳۴۳ھ

۸۔ شرح اسماء الحسنیٰ، اسماء الحسنیٰ کی شرح وتفسیر ۱۹۲۴ء

۹۔ تصحیح کنز الہدایت، مولانا محمد باقر لاہوری خلیفہ خواجہ محمد معصوم کی تصنیف کی تصحیح، ۱۳۲۵ء، صفحات ۱۲۴ (۱۰)

ان کا دو اشعار ہی مل سکے ہیں جو انھوں نے اپنے پیر ومرشد شاہ ابوالخیر دہلوی کی شان میں کہے تھے:

بایں شکل خیرِ مجسم که دید وجودش همه خیر آمد یدید
کند کاملِ دهر از یک نظر اگر فتند چشمِ لطفش به ناقص (۱۱)

مستری چراغ دین (۱۸۵۷ تا ۱۹۳۵ء)

۱۸۵۷ء کے لگ بھگ قطب دین کے ہاں پسرور میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملٹری انجینئرنگ سروس میں ملازم ہو گئے۔ فوج میں بہت سے انگریز افسران سے تعلق بن گیا تھا۔ پیشہ ورانہ مہارت اور اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے لارڈ کچنر (۱۸۵۰ تا ۱۹۱۶ء) سے متعدد تعریفی اسناد حاصل کیں۔ بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ حقے کی چلم گرم کرنے کے لیے لارڈ صاحب کے تعریفی خطوط بھی استعمال کر لیتے تھے۔ طبیعت میں درشتی تھی مگر اس کے باوجود مزاح نگاری بھی کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں حج بیت اللہ کے لیے گئے واپسی پر ''حج کا ساتھی'' کے نام سے

سفر نامہ لکھا جسے خواجہ حسن نظامی نے حلقہ مشائخ دہلی کی طرف سے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔ اس کے ۱۲۵ صفحات تھے۔ مستری چراغ دین اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور مستری تخلص کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں فوت ہوئے (۱۲)۔

حکیم خادم علی خادمؔ سیالکوٹی (۱۸۶۶ تا ۱۹۷۱ء)

حکیم خادم علی ۱۸۶۶ء میں حکیم احمد دین بن علامہ غلام محمد قادری کے ہاں کوٹلی لوہاراں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ حافظ قرآن، علوم دینیہ کے ماہر، طب کے نابغہ اور شعر و شاعری میں باکمال تھے۔ شاعری میں مولانا عبدالقادر ہزاروی سے اصلاح لیا کرتے تھے جبکہ حافظ محمد عبدالکریم نقشبندی مجددی عیدگاہ شریف راولپنڈی سے بیعت تھے۔ امیر ملت سید جماعت علی شاہ نے بھی خلافت سے نواز رکھا تھا۔ آپ سید صاحب کے خاص طبیب تھے، بلانافہ سیالکوٹ سے علی پور سیداں علاج معالجہ کے لیے جایا کرتے تھے۔ حکیم صاحب ۳۰ جمادی الثانی ۱۳۹۱ھ/ ۲۱ اگست ۱۹۷۱ء کو حکیم خادم علی روڈ سیالکوٹ میں واصل حق ہوئے اور ان کو وہیں دفن کیا گیا۔ اس سڑک اور محلے کا نام انہیں سے منسوب ہے۔ آج بھی ان کا مزار اور مطب اسی روڈ پر موجود ہے۔ حکیم صاحب فارسی اردو اور پنجابی میں اشعار کہا کرتے تھے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ درسِ عبرت، ۲۔ گلدستہ عقیدت، ۳۔ دیوانِ خادمؔ، ۴۔ پنجابی نعتیہ کلام

پہلی کتاب ان کی فارسی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس میں اردو ترجمہ بھی ساتھ شامل ہے۔ دوسری کتاب میں بھی ان کا فارسی کلام بمع پنجابی ترجمہ کے شامل کیا گیا ہے۔ تیسری کتاب ان کے عربی، فارسی اور اردو کلام پر مستمل ہے جبکہ چوتھی کتاب میں ان کی پنجابی نعتیں شامل ہیں جس تک راقم کو رسائی نہیں مل سکی۔ مگر ان کا ادبی سرمایہ حمد، نعت اور منقبت پر ہی مشتمل بتایا جاتا ہے۔ ان کی ایک فارسی نعت بھیالی سیالکوٹ کے نعت نمبر میں بھی شامل کی گئی ہے۔ ذیل میں ان کی ایک نعت کے چند شعر پیش ہیں:

زهی سعادتِ آنگس که در مدینه رسید — بوقتِ شوق و محبت بپائ سرهد و دید
نمی روم به پیشِ کسی پئ حاجت — چوبهرِ فتح مطالب محمدؐ است کلید
زنارِ دوزخِ سوزاں چراغ می دارد — که هست در دل و جانش هوئ خیرِ عبید
بده تُو رشکِ مسیحا دوائی دردِ فراق — که جانِ خادمِ عاصی زغم بلب به رسید (۱۳)

ان کے بارے میں ماہنامہ انوار الصوفیہ سیالکوٹ کے مارچ ۱۹۴۱ء، سیرت امیر ملت از سید اختر حسین علی پوری،

اولیائے سیالکوٹ از رشید نیاز، امیر ملت اور اُن کے خلفاء اور جامع اردو انسائیکلو پیڈیا جلد اول اور سیالکوٹ میں پنجابی ادب کی روایت میں بھی معلومات درج ہیں۔

ظفر علی ظفر پسروری (۱۸۷۰ تا ۱۹۱۸ء)

حافظ ظفر علی ظفر کی ولادت ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۰ء میں پسرور ضلع سیالکوٹ کے ایک ہاشمی قریشی گھرانے میں ہوئی۔ والد گرامی کا نام اشرف علی بن حامد علی تھا۔ قرآن پاک کے حافظ، عربی، فارسی کے ماہر اور ایف اے تک انگریزی پڑھے ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ تک ریاست کشمیر میں امیدوار نائب تحصیلدار کے طور پر کام کرتے رہے۔ عالم شباب میں امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری کے گرویدہ ہوئے اور ان کی خدمت میں رہنے لگے۔ سفر و حضر میں اُن کے ساتھ رہتے۔ حضرت امیر ملت نے ان کو اجازت و خلافت سے نواز رکھا تھا اور انجمن خدام الصوفیہ ہند کا جنرل سیکرٹری مقرر کر رکھا تھا۔ پسرور سے محض نو دس میل دور تھے مگر اٹھارہ سال تک پسرور کا مُنہ تک نہ دیکھا۔ خطیب اور اعلیٰ پایہ کے مناظر تھے۔ اکثر وقت ذکر و فکر اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ آپ اردو اور فارسی میں اچھا خاصا شوق رکھتے تھے اور ان دونوں زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا کلام ماہنامہ ''انوارُ الصوفیہ'' لاہور میں شائع ہوتا تھا۔ ان کی ایک اردو نعت بھیالی سیالکوٹ میں بھی شامل کی گئی ہے۔ ذیل میں امیر ملت قدس سرّہ العزیز کی شان میں لکھی گئی ان کی ایک فارسی منقبت سے چند اشعار پیش ہیں:

سراپہ حسن از عالم یگانہ ندیدہ مثلِ اُہ چشمِ زمانہ
بصورتِ آفتابِ عالم افروز بسیرت ہم ازوآں بہرہ اندوز
بش را باتبسم ہم عنابی کلامش ہست جملہ دُرفشانی
بقا بادش چو عمر نوحے بل پیش کہ خورسند است ازو بیگانہ و خویش(۱۴)

آپ کی رحلت ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۸ء/ ۲۴ محرم ۱۳۳۷ھ بروز جمعرات کو ہوئی۔ ان کو تحصیل دروازہ کے باہر قدیمی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ صاحب تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' نے ان کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے اپنے ماخذات میں سیرتِ امیر ملت، تذکرہ شہ جماعت، فیضانِ امیر ملت، تاریخ پسرور از سید سلطان محمود حسین، ماہنامہ انوار الصوفیہ اور المعات الصوفیہ کا ذکر کیا ہے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۷ تا ۱۹۳۸ء)

ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو گلی وہاب پورہ، محلہ کشمیریاں سیالکوٹ میں شیخ نور محمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ گھر والوں نے ان کا نام محمد اقبال رکھا۔ ابتدائی تعلیم مولانا غلام حسن ڈھکی شوالہ والوں سے حاصل کی۔ پھر مولانا سید میر حسن کے اصرار پر ڈاکٹر صاحب کو سید میر حسن کے پاس بھیجا جانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب، مولانا کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ یہاں سے انھوں نے اردو، فارسی، عربی زبان اور صرف ونحو پڑھی۔ اس کے بعد اسکاچ مشن سکول میں داخل ہوئے۔ اسی سکول سے ۱۸۹۳ء میں میٹرک، ۱۸۹۵ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ یہ سکول پہلے انٹرمیڈیٹ بنا اور پھر اس کو مرے کالج کا نام دے دیا گیا۔ اسی لیے چند محققین نے لکھا ہے کہ علامہ صاحب نے ایف اے مرے کالج سے کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۸۹۸ء میں بی اے کیا۔ بی اے میں انھوں نے انگریزی، فلسفہ اور عربی جیسے مضامین رکھے تھے۔ عربی مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے پڑھا کرتے تھے۔ علامہ صاحب نے ۱۸۹۹ء میں فلسفے میں اسی کالج میں رہ کر ایم اے کیا اور پنجاب بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ بعد میں اسی کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب اِک وقت میں تین تین مضامین پڑھایا کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۵ میں انگلستان جا کر کیمبرج یونیورسٹی ٹرنٹی کالج میں داخلہ لیا مگر ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی بیرسٹری کے لیے لنکز اِن کے ساتھ خود کو منسلک کر لیا۔ ۱۹۰۸ء میں قانون کی تعلیم مکمل کی۔ اسی دوران میونخ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کا اعزاز بھی حاصل کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے وکالت بھی کی اور پروفیسری بھی۔ چھوٹی عمر میں ہی شعر کہنے کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ جب آپ ایم اے کے طالب علم تھے اس وقت ان کی غزل کا ایک شعر سن کر مرزا ارشد گورگانی نے کہا تھا "اقبال مستقبل کے عظیم شعراء میں سے ہوگا"۔

ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال پنجابی، عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور جرمن زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ ویسے انھوں نے شاعری صرف فارسی، اردو اور پنجابی میں ہی کی ہے۔ بزم ادب اڈا شہباز خاں کے تحت ہونے والے مہینہ وار مشاعروں میں اپنی نظمیں اور غزلیں بھی سنایا کرتے تھے۔

اُن کا اردو اور فارسی میں کہا گیا کلام انقلابی نوعیت کا ہے جس کے اثر سے سب سے پہلے موجودہ پاکستان، بنگلہ دیش کے علاوہ ہندوستان کے کئی دوسرے علاقوں اور بعد میں کئی دیگر ملکوں نے حریت کا سبق از بر کیا اور آزادی حاصل کی۔ ان کی فارسی شاعری کو ایران، افغانستان، ترکمانستان، کرغیزستان، تاجکستان، ازبکستان اور روس سے آزادی حاصل کرنے والے دیگر فارسی بولنے والے ملکوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ ایران میں تو علامہ صاحب کے اشعار

کے بغیر جمعۃ المبارک کا خطبہ ہی مکمل نہیں ہوتا۔علامہ صاحب کی صوفیانہ، مذہبی اور سماجی فکر اعلیٰ سطح کی ہے۔اس حوالے سے سینکڑوں کتابیں اور ہزاروں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔سیاسی حوالے سے بھی علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی سوچ اتنی پختہ تھی کہ ان کو قیام پاکستان کا ابتدائی خاکہ بنانے والا اور پاکستان کا خواب دیکھنے والا شمار کیا جاتا ہے۔پاکستان بنانے میں ان کا کردار روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آچکا ہے اس لیے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔انگریزی زبان، ادب اور اسلامی طرز حیات کا جتنا خوبصورت اظہار ان کے اپنے مضامین میں نظر آتا ہے شائد اتنا اچھا مضمون کئی ڈاکٹر پوری زندگی میں ایک بھی نہیں لکھ پاتے۔علم وفضل، خدمات اور ذاتی خوبیوں کی بنیاد پر حکومت برطانیہ نے ۱۹۲۲ء میں آپ کو سر کا خطاب دیا۔

ڈاکٹر صاحب کئی حیثیتوں کے مالک تھے۔وہ جتنے اچھے استاد تھے اتنے ہی اچھے سیاستدان اور وکیل بھی تھے۔سیاسی حوالے سے بات کریں تو ۱۹۲۶ء میں وہ پنجاب قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔تعلیمی حوالے سے دیکھا جائے تو وہ پنجاب یونیورسٹی کے عربی اور فارسی کے بورڈ آف سٹڈیز کے چیئرمین بھی رہے۔ان کو اسلامیہ کالج کے بورڈ آف گورنرز کے ممبر رہنے کا موقع بھی ملا۔ایک مفکر کے طور پر انھوں نے پہلے مسلم لیگ کے قیام میں اپنا کردار ادا کیا، پھر جناح صاحب کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے رہے اور ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا تصور پیش کیا۔قیام پاکستان کے وقت وہ زندہ تو نہ تھے مگر اُن کی سوچ آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

علامہ صاحب ۱۸۹۷ء تک اپنے سیالکوٹ والے گھر میں رہتے رہے، پھر لاہور اور دوسرے ملکوں میں رہنے لگے۔جب تک اُن کے والدین زندہ رہے وہ ہر ہفتہ اور اتوار نیز گرمیوں کی چھٹیاں ان کے پاس گزارتے۔ والدین کی وفات کے بعد بھی وہ ایک بار سیالکوٹ آئے تھے۔ان کے پاس کچھ عرصہ برطانوی شہریت بھی رہی۔ایک بھرپور سماجی، سیاسی، ادبی اور فکری زندگی بسر کرنے کے بعد علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو فوت ہوئے اور بادشاہی مسجد لاہور کے باہری دروازے کے ساتھ دفن ہوئے۔

ابھی تک ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ ذیل کتب کا پتہ چلا ہے:

۱۔علم الاقتصاد (اردو)، ۱۹۰۳ء، ۲۔فارس میں ماوراء الطبیعات کا ارتقاء (انگریزی سے اردو ترجمہ)، ۱۹۰۸ء، ۳۔اسرارِ خودی (فارسی)، ۱۹۱۵ء، ۴۔رموزِ بے خودی (فارسی) ۱۹۱۷ء، ۵۔پیامِ مشرق (فارسی)، ۱۹۲۳ء، ۶۔بانگِ درا (اردو)، ۱۹۲۴ء، ۷۔زبورِ عجم (فارسی)، ۱۹۲۷ء، ۸۔مثنوی مسافر، (فارسی)، ۱۹۳۰ء، ۹۔اسلام میں مذہبی افکار کی تعمیرِ

نو (انگریزی)، ۱۰۔ ۱۹۳۰ء پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق (فارسی)، ۱۹۳۱ء، ۱۱۔ جاوید نامہ (فارسی)، ۱۹۳۲ء، ۱۲۔ بالِ جبریل (اردو)، ۱۹۳۵ء، ۱۳۔ ضربِ کلیم (اردو)، ۱۹۳۶ء، ۱۴۔ ارمغانِ حجاز (فارسی)، ۱۹۳۸ء

شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے شاعری بھی کی ہے۔ اردو میں ''مکڑا اور مکھی''، ''پہاڑ اور گلہری''، ''گائے اور بکری'' نیز دعائیہ نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' عالمی سطح پر مشہور ہوئیں۔ ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں بین الاقوامی سطح پر اپنا آپ منوا چکی ہیں۔ آپ کی مادری زبان پنجابی تھی۔ انھوں نے پنجابی میں بہت کم لکھا ہے البتہ اردو میں ان کی چند کتابیں سامنے آچکی ہیں جن کو اردو ادب میں قابلِ فخر مقام حاصل ہے مگر ان کا زیادہ کام فارسی میں ہے۔ فارسی میں ماوراء الطبیعات کا ارتقاء، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، مثنوی مسافر، زبورِ عجم، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، جاوید نامہ اور ارمغانِ حجاز ان کی فارسی دانی کا منہ بولتا ثبوت بن کر آج بھی زندہ و جاوید ہیں۔ تذکرہ شعرائے کشمیر میں ان کے نام کے ساتھ کشمیری درج ہے۔ جو کہ ان کے ماضی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مختلف تذکروں اور تاریخوں میں ان کی ذات، علمی و ادبی خدمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے (۱۵)۔ یہاں مضمون میں حاضری کے لیے ایک نمونہ کلام پیش ہے :

صورت نہ پرستم من بتخانہ شکستم من — آن سیل سبک سیرم هر بند گسستم من
در بود و نبود من اندیشه گماں ها داشت — از عشق هویدا شد ایں نکته که هستم من
در دیر نیاز من در کعبه نمازِ من — زنار بدوشم من تسبیح بدستم من
سرمایه درد تو غارت نتواں کردن — اشکے که ز دل خیزد در دیده شکستم من
فرزانه بگفتارم دیوانه به کردارم — از باده شوق تو هشیارم و مستم من(۱۶)

ماسٹر خواجہ محمد کرم الٰہی ایڈووکیٹ سیالکوٹی (۱۸۸۰ تا ۱۹۸۹ء)

ماسٹر خواجہ محمد کرم الٰہی میاں غلام قادر نائیک کے ہاں ۱۸۸۰ء میں بڈیانہ تحصیل پسرور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پردادا خواجہ عبدالرحیم نائیک نے کشمیر سے ہجرت کے بعد اس قصبہ کو سکونت کے لیے چُنا تھا۔ خواجہ صاحب نے ۱۸۹۵ء میں سیالکوٹ سے میٹرک پاس کیا اور مدرس بن کر کوہاٹ میں تعینات ہوئے۔ ملازمت کے ساتھ پڑھائی جاری رکھی۔ ۱۹۰۰ء میں ایف اے، ۱۹۰۲ء میں، بی اے ۱۹۰۴ء میں اور ایل ایل بی کا امتحان ۱۹۰۵ء میں پاس کیا۔ اسی سال اُن کو دیوانی، فوجداری اور محکمہ مال کے مقدمات کی اجازت مل گئی۔ واپس آ کر سیالکوٹ کے محلہ کشمیریاں میں

رہنے لگے۔ ان کے نام کے ساتھ ماسٹر پہلے لگ چکا تھا بعد میں ایڈووکیٹ لگا۔ امیر ملت سے خلافت حاصل کر چکے تھے۔ تحریک پاکستان کے سرگرم رُکن رہے۔ امیر ملت کے مقدمات بھی آپ ہی لڑا کرتے تھے۔ مقامی سیاست میں کافی دخل تھا۔ برس ہا برس میونپل کمشنر رہے، کئی دفعہ انزری سیکرٹری بھی چنے گئے اور انوار السوفیہ سیالکوٹ کے تازیست ایڈیٹر بھی رہے۔ پانچ بار خود حج کیا اور اٹھارہ بار بدل حج کی سعادت حاصل کی۔

ایڈووکیٹ صاحب ۲۵ دسمبر ۱۹۸۹ء/ ۲۴ جمادی الثانی ۱۳۷۹ء کو چند دن بخار میں مبتلا رہ کر فوت ہوئے اور اسی شہر میں دفن ہوئے۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کی ایک منقبت کے چند شعر پیش ہیں:

شاہِ جماعت شہ علی محبوبِ ربّ ذوالجلال — نیک دل نیکو سیّر نیک رُو نیک و خصال
خُوب رُو و پاک باطن، پاک جان و پاک دل — مخزنِ کشف و کرامت صاحبِ حسن و جمال
سیّد السادات مقبولِ خدائی دوسرا — نام پاکش دافع رنگ و بلا و ہر ملال
بس شگفتہ خاطر وھم عکس رُوئی مصطفٰے — سیّد عالی نسب والا حسب شیریں مقال
مصدرِ لُطف و عنائت مخرنِ جُود و سخا — معدنِ رشد و ھدایت منبعِ لطف و کمال
مظھرِ نورِ نبیؐ و پرتوِ خُلقِ عظیم — قاسمِ ایمان و ایقان آں شہِ فرخندہ حال
ھر دعائیش می شود مقبول پیش از التجا — استجابت زود می آئد ربِ ذوالجلال
او مجدّد ھم محدث بود قیومِ زماں — معطی انوارِ ایماں قاسمِ جاہ جلال
ای خدا ایں دودماں را تا ابد محفوظ دار — از ھمہ فکر و بلا و از ھمہ رنج و ملال
ایں دعائے بینوا کرمؔ الھی کُن قبول — از طفیل خواجگان محبوبِ ربِّ ذوالجلال(۱۷)

مولوی محمد شاہ الدین سروری قادری (۱۸۸۰ء)

مولوی شاہ الدین رنگ پورہ سیالکوٹ میں قطب دین قریشی کے گھر ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پردادا مولوی خدا بخش قادیاں (چک قاضیاں) ضلع گورداسپور بھارت کے رہنے والے تھے۔ بعد میں انھوں نے کوٹلی لوہاراں سیالکوٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ شاہ الدین ہوراں کے دادا مولوی غلام مصطفٰے نے سیالکوٹ کے محلہ رنگ پورہ میں سکونت اختیار۔ بعد میں ان کے والد صاحب مولوی قطب الدین نے پکا گڑھا سیالکوٹ میں رہائش اختیار کی جہاں اج بھی ان کے ورثاء رہ رہے ہیں۔ محمد بوٹا سہیل ان کے کام کی دیکھ بھال کر رہے ہے۔ انھوں نے فارسی اور عربی گھر سے سیکھی۔

مولوی شاہ الدین نحو، منطق، فقہ، حدیث، عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور پنجابی زبان پر مہارت رکھتے تھے۔ تدریس کے علاوہ منشی گیری بھی کرتے رہے۔ اپنے پیر و مرشد سید اصغر علی شاہ کے کہنے پر فارسی اور عربی کتب کے تراجم کی طرف متوجہ ہوئے۔ عربی اور فارسی کی اہم ترین کتابوں کے تراجم پنجابی نظم میں کیے۔ انھوں نے ترجمہ کے ذریعے فارسی اور عربی ادب کے انمول شہہ پاروں سے پنجابی ادب کا دامن بھر دیا۔ انھوں نے مندرجہ ذیل تراجم کیے:

۱۔ حضرت سلطان باہوؒ کا ''دیوانِ باہو''، ۲۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ''دیوانِ غوث الاعظم''، ۳۔ حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ''دیوانِ خواجہ معین الدین چشتی''، ۴۔ حضرت شاہ شرف الدین پانی پتیؒ کا ''دیوانِ بوعلی قلندر''، ۵۔ ''رُباعیاتِ بوعلی قلندر'' اور ۶۔ ''مثنوی بوعلی قلندرؒ''، ۷۔ حضرت محمود شبستری رحمۃ اللہ علیہ کے ''دیوانِ محمود'' اور ۸۔ ''گلشن راز''، ۹۔ شمس الدین حافظ شیرازی کا ''دیوانِ حافظ''، ۱۰۔ حضرت جلال الدین رومی کی مثنوی ''مثنوی شریف'' (چھ دفتر، ابھی تک ایک دفتر ہی شائع ہو سکا ہے)، ۱۱۔ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی ''مثنوی بیسر نامہ'' شاہ شمس تبریزؒ کی مثنوی ۱۲۔ ''مثنوی شمس تبریز''، ۱۳۔ شیخ فریدالدین عطارؒ کا ''قصیدہ وحدت''، ۱۴۔ حضرت غلام محمد صدیقی القادری لاہوری کا ''قصیدہ اسرارِ حقانی''، ۱۵۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ''دیوان علیؓ'' اور ۱۶۔ ''مناجات حضرت علی یعنی دعائے سامع''، ۱۷۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ''مناجات حضرت ابوبکر صدیقؓ'' اور ۱۸۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لکھے ہوئے عربی قصیدے ''قصیدہ حضرت اِمامِ اعظمؒ'' کا رواں پنجابی نظم میں ترجمہ۔

طبع زاد کتابیں ۱۹: ۔مولود شریف موسوم بہ اسم مُنیر العرش والفرش، ۲۰۔ نوائے عشاق، ۲۱۔ صلوۃ العارفین (۱۸)

مندرجہ بالا تمام تراجم ان کی فارسی اور عربی زبان و ادبیات پر مہارت کا ثبوت ہیں۔ ذیل میں ان کا کیا ہوا ایک ترجمہ پیش ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ مولوی شاہ الدین سروری قادری کو فارسی ادب پر کس قدر دسترس حاصل تھی۔ یہ نمونہ کلام خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے دیوان سے لیا گیا ہے: اس غزل کے سولہ شعر ہیں جن میں سے سات بمع ترجمہ پیش ہیں:

ای ز شرم روی ماهت در عرق غرق آفتاب
و از فروغ ماهِ رخسارِ تو ماه اندر نقاب

آفتاب از خاکِ راهت یافت چشم لا جرم
در فضائ آسماں زد خیمه زریں طناب

گرزا انوارِ رخت یک شعله تا بد بر فلک
از حیا مستور گرود آفتاب اندر نقاب

نورِ حق است آں مجسم گشته در ذاتِ نبیؐ
همچو نور ماه کز خورشید کر دست اکتساب

فقره خنگ چرخ را از مه کُشد زریں لگام
در شبِ اسرا چو آرد پائ همت در رکاب

از فلک بگذر که فوق العرش منزل گاہِ اوست　　چوں کند ازم سفر ای خواجه عالی جناب
سرما اوحی نگنجد در ضمیر جبرائیل　　کشف اسرار لدنی کی کند امّ الکتاب
در مقامِ لی مع اللہ از کمال اتصال　　از خُدا نبود جدا همچو شعاع از آفتاب
از محمدؐ دیده باید فرض کردن در بهشت　　جونکه بیروں آید انوار تجلی از حساب(۱۹)

مولوی شاہ الدین قادری سروری کا کیا ہوا پنجابی ترجمہ یہ ہے:

سورج غرق عرق وچ ہویا مُکھڑا ویکھ پیارا　　تے چن پڑدے دے وچ چھپیا ویکھ تیرا رخسارا
سُورج مٹی قدم تیرے تھیں عزت عظمت پا کے　　اَسماناں دے اُتے اپنا ڈیرہ لایا جا کے
شعلہ نوری مکھ تیرے دا جے اسمانیں چمکے　　شرم کرے چھپ جاوے سورج نہ چمکے نہ دمکے
ظاہر باطن جسم نبیؐ دا خاصہ ذات الٰہی　　جیوں روشنائی سورج والی چن دے اندر آئی
اَسماناں تے کرے سواری چن تھیں واگ بناوے　　شب معراج قدم جد اپنا وچہ رقاباں پاوے
لنگھ اَسمانوں کیوں جے دلبر عرش اوتے نت رہندا　　جدوں کرے اوہ سفر اِرادہ اوتھے جا کے بہندا
بے حساب تجلّے ویکھیں جو جنت وچ اڑیا　　ایہہ سب نُور محمدؐ جانیں ظاہر باطن کھڑیا(۲۰)

سید اصغر علی سروری قادری ہوراں دے تاریخ وفات اُتے فارسی وچ چار بند لکھے جنھاں وچوں اک انج اے:

چوں محرم الحرام آمد رفت یوم جمعه و شام است　　واپسیں عمر و پیر قد الف بلبل گلستانِ شاہِ نجف
حضرت پیر علی اصغر شاہ از رتالہ شریف سرِ اله　　گفت هاتف بگوش شاہ دین سالِ تاریخ آں مجدد دیں
کرد پرواز در فضائ احد رهنمائ روضه واحد(۲۱)

امین حزیں (۱۸۸۴ء)

خواجہ محمد مسیح پال کا قلمی نام امین حزیں تھا۔ فارسی میں حزیں اور اردو میں امین تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۸۴ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوے۔ انھوں نے عربی، فارسی کی تعلیم مولوی سید میر حسن سے حاصل کی جو علامہ اقبال کے استاد تھے۔ اردو اشعار کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ گلبانگِ حیات، ۲۔ اوراقِ گل

ان کے فارسی کے چند اشعار پیش ہیں:

دلم را محرمِ راز جهاں ساز　　کلیدِ قفلِ گنجِ کن فکاں ساز
الهی انشراحِ صدر خواهم　　درونم پاک از وهم و گماں ساز
الهیٰ پای چوبین حاجتم نیست　　که شهپرِ جبریل دارم
نوای عندلیبان در خورم نیست　　که ذوقِ صورِ اسرافیل دارم
الهی قسمتِ شمعم عطا کن　　که سوزم نور بخشد کوکبی را
همین یک آرزو چون مهر دارم　　که تابان چون سحر شبی را(۲۲)

قاضی شمس الدین شمسؔ سیالکوٹی (۱۸۹۳ تا ۱۹۶۶)

قاضی شمس الدین، قاضی امیر الدین کے ہاں جموں میں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا کا نام قاضی اَحد جُو اور پردادا کا نام قاضی رسول جُو تھا۔ ان کے جدّ امجد مہاراجہ پرتاب سنگھ کے ہاں قاضی کے عہدہ پر فائز تھے بعد میں ان کے والد بھی اسی عہدہ پر تعینات ہوئے۔ قاضی شمس الدین بی اے کرنے کے بعد انسپکٹر جنرل پولیس جموں کے سپرنٹنڈنٹ تعینات ہوئے۔ ۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو ہجرت کر کے پاکستان آئے اور سیالکوٹ کو اپنا مسکن بنالیا۔ قاضی صاحب خود ،ان کے والد اور باقی خاندان امیرِ ملت کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ فارسی، اردو اور پنجابی میں شاعری کرتے تھے۔ البتہ ان کا تعلق حمد، نعت اور منقبت کے ساتھ زیادہ گہرا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں ان کا ایک شعری مجموعہ ''میخانۂ خُلد'' کے نام سے طبع ہوا۔ ان کا باقی کلام ان کے بیٹے فیاض احمد مقیم راولپنڈی کے پاس بتایا جاتا ہے۔ ان کی ایک فارسی نعت نمونہ کلام کے طور پر پیش ہے:

ای نسیما خبری سیّدِ ابرارؐ بیار　　بهری تسکینِ دلم مُژدۂ سرکارؐ بیار
تا معطّر کُنعم از نگهتِ اُو جان و دلم　　بوئ گیسوئ معنبر زدرِ یار بیار
در فراقش دلم و دیدۂ من بارد　　تاعلاج بگنم خاکِ درِ یار بیار
شمسؔ آں چهرۂ مقصودِ نظر می آید　　تُو اگر خواهی دل آئینۂ کردار بیار(۲۳)

محمد صادق پسروری لکھتے ہیں کہ ان کا وصال ۱۰ مئی ۱۹۶۶ء کو سیال کوٹ میں ہوا اور سیالکوٹ میں ہی دفن کیے گئے۔ ان کے بارے میں انوار الصوفیہ لاہور کے نومبر ۱۹۴۳ء، اگست اور ستمبر ۱۹۶۱ء میں کافی کچھ شائع ہوا۔

حکیم محمد نعمان ساجد (۱۸۹۷ تا ۱۹۵۳ء)

اصل ناں محمد نعمان تخلص ساجد ہے۔ حکیم صادق علی کے ہاں ۳ نومبر ۱۸۹۷ء نوں پسرور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں میٹرک کیا اور ۱۹۲۲ء میں زبدۃ الحکماء کا امتحان پاس کیا اور اس میں گولڈ میڈل لیا۔ گورنمنٹ میڈیکل سٹور ڈپو لاہور میں ملازم تھے اور بطور سپرنٹنڈنٹ کام کر رہے تھے جب ۱۹۵۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۳ء کو مغل پورہ لاہور میں فوت ہوئے۔ ان کو ڈاکٹر علامہ اقبال کے ذاتی معالج کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ اردو اور فارسی پر مکمل گرفت تھی۔ ان کی مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ داغِ جبیں، ۲۔ قندِ فارس، ۳۔ عرفان القرآن (قرآن کریم کا اردو ترجمہ) (۲۴)

اِن کے سات اردو کلام اور ایک فارسی کلام شعرائے پسرور میں شامل ہے۔ ذیل میں ان کا ایک فارسی کلام پیش ہے:

بر درِ دولت تُو بندہ نواز آمدہ ام — دل نوازی کہ بصد عجز و نیاز آمدہ ام
آبِ دیدار تُو افزود مرا تشنہ لبی — چُوں بہ یک بار شُدم سیر نہ باز آمدہ ام
تا تُرا بر سرِ بازار بگیرم باری — از سرِ بام حقیقت بہ مجاز آمدہ ام
سنگِ اسوَد کہ ازو زینتِ کعبہ افزود — بھر یک بوسۂ آں سوئے حجاز آمدہ ام
ای کہ از جلوۂ تُو مشرق و مغرب روشن — بھرِ دیدارِ تُو از دُور دَراز آمدہ ام
زانکہ مسجد را ہمہ خانۂ تُو می گوئند — مَن بہ اُمیّد لقا وقت نماز آمدہ ام
ساجدا از پر و بال اُو پرم بر اَفلاک — خوش نصیبم زنشیبی بہ فراز آمدہ ام(۲۵)

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی (۱۹۰۷ء)

۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو مغلاں والی تحصیل سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں انگریزی اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں پریس اتاشی ہو کر ایران گئے۔ ۱۹۵۵ء میں واپس ہوئے تو ''مجلہ ہلال'' فارسی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور دوبارہ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۳ء تک پریس اتاشی کی حیثیت سے سفارت کانہ پاکستان تہران میں کام کرتے رہے۔ فرائض منصبی انجام دینے کے علاوہ ایران میں علمی اور تحقیقی کام بھی کرتے رہے اور بہت سی کتابیں فارسی میں لکھ ڈالیں۔ ان کی طبیعت بچپن سے ہی فارسی شعر و ادب کی

طرف مائل تھی۔ایران میں طویل قیام سے یہ شوق اور بھی نکھر کر سامنے آیا۔اس لیے ان کی نثر اور نظم جدید ایرانی فارسی کے بہت قریب ہے۔ان کی چند کتب یہ ہیں:

۱۔رومی عصر (علامہ اقبال)،مطبوعہ،تہران،۱۹۵۱ء

۲۔انتخابِ شعر معاصر فارسی،شامل تذکرہ ۱۷ شاعر معاصر ایران،مطبوعہ،لاہور،۱۹۵۳ء

۳۔اقبال ایرانیوں کی نظر میں،اقبال اکیڈمی مطبوعہ،کراچی،۱۹۵۵ء

۴۔شرحِ احوال و آثار ملک الشعراء بہار،مطبوعہ،ابن سینا تہران،۱۹۵۷ء

۵۔فارسی امروز،مطبوعہ،لاہور،۱۹۵۶ء

۶۔ایرانِ صغیر،تذکرہ شعرائے پارسی زبان کشمیر،مطبوعہ،تہران،۱۹۵۷ء

۷۔ترجمہ فارسی ضربِ کلیم اقبال،اقبال اکیڈمی،مطبوعہ،کراچی،۱۹۵۷ء

۸۔داستانہای عشق پاکستان،مطبوعہ،تہران،۱۹۶۱ء

۹۔سرور سرمد،مطبوعہ،تہران،۱۹۶۳ء(۲۶)

سید الطاف حسین مشہدی (۱۹۱۴ تا ۱۹۹۱ء)

الطاف مشہدی،سید الطاف حسین مشہدی ولد علی حسنین شاہ ۱۰فروری ۱۹۱۴ء کو آلو مہار تحصیل ڈسکہ میں پیدا ہوئے۔شاکر کنڈان ایک حوالے سے بتاتے ہیں کہ وہ ۱۰جون ۱۹۱۴ء کو چک نمبر ۱۱۰جنوبی سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ کچھ لوگ ان کا سالِ پیدائش ۱۹۱۷ء بھی بتاتے ہیں۔بچپن میں ہی ان کے سر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔چک نمبر ۱۱۰جنوبی سرگودھا،لالیاں ضلع جھنگ،جامکے ضلع سیالکوٹ اور دلی میں علم حاصل کیا۔اردو ادب کو تصویرِ احساس،الطاف کے گیت،ڈگر،الطاف کے نغمے،ریحانہ،داغ بیل،پریت کے گیت،لذتِ رنگ و بو،مقاماتِ نظر اور شاخِ گلور کے شعری مجموعے دے کر ۱۹۹۱ء میں سرگودھا میں فوت ہوئے(۲۷)۔

ڈاکٹر مقبول الٰہی ملک (۱۹۱۹ء)

ڈاکٹر مقبول الٰہی ملک ۱۵دسمبر ۱۹۱۹ء کو قاضی فضل الدین ولد غلام مصطفی بن مولوی محمد پناہ کے ہاں موضع میرو بھٹہ یار تحصیل پسرور میں پیدا ہوئے۔ان کے والد پچھلی صدی کے اوائل میں نوکری کے سلسلہ میں یہاں منتقل ہوئے تھے۔وہ پٹواری سے ترقی پا کر نائب تحصیل دار بنے اور ۱۹۴۲ء میں ریٹائر ہوئے۔

مقبول الٰہی ملک نے گورنمنٹ انٹر میڈیٹ کالج پسرور سے ۱۹۳۵ء میں میٹرک اور ۱۹۳۵ء میں انٹر کا امتحان پاس کیا۔گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۹ء میں بی اے آنرز اور اسی کالج سے ۱۹۴۱ء میں ایم اے تاریخ کیا۔ ۱۹۴۳ء میں ایم اے عربی اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ایک طلائی تمغہ، دونقرئی تمغے اور دوسو روپے نقد انعام حاصل کیا۔کل ہند مقابلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں محکمہ سنٹرل پی ڈبلیو ڈی میں بطور اسٹنٹ ملازم ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں مقابلے کا امتحان دوسری بار پاس کیا اور انکم ٹیکس آفیسر تعینات ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں ممبر سنٹرل ریونیو بورڈ اسلام آباد مقرر ہوئے۔مستقل طور پر ۹ ڈی سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں رہائش پذیر رہے۔محکمانہ ذمہ داریوں اور تربیت کے سلسلہ میں امریکہ، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی میں بھی جانے کا موقع ملا۔ ۴۷ سال کی عمر میں پی ایچ ڈی کی۔

ان کو کالج میں داخلہ سے قبل ہی ادبیات کا شوق لگ چکا تھا۔چھٹی جماعت میں پہنچنے پر ان کے والد صاحب نے ان کو ''بانگِ درا'' تحفہ میں دی تھی۔ان کی والدہ کو پنجابی شعراء کے بہت سے اشعار یاد تھے۔گھر میں اکثر بیت بازی کے مقابلے ہوتے۔کالج میں ان کو صاحب ذوق اساتذہ کی رہنمائی میسر آئی جس کی وجہ سے ان کو کالج میگزین کا ایڈیٹر چُنا گیا۔ان کے ہندی گیت اور اردو کلام کالجوں کے رسالے میں چھپتا رہتا تھا۔ان کو انگریزی، اردو، پنجابی اور فارسی شاعری کے شوق کے ساتھ ساتھ تراجم کا بھی شوق رہا۔انگریزی، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے ماہر تھے۔انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں اور تراجم کیے۔

۱۔ابیات باہو، پنجابی سے انگریزی ترجمہ، ۱۹۷۶ء۔ ۲۔اشلوک بابا فرید، پنجابی سے انگریزی ترجمہ، ۱۹۶۸ء۔ ۳۔نعیم صدیقی کی کتاب زخموں کی زبان کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ، ۱۹۸۸ء، ۴۔اسرار خودی منظوم انگریزی ترجمہ، ۱۹۸۶ء، ۵۔مثنوی مسافر، ۱۹۸۸ء، ۶۔رموزِ بےخودی، ۲۰۰۳ء انگریزی میں منظوم ترجمہ، ۷۔اردو میں فارسی اور عربی ضرب الامثال، ۱۹۹۶ء، ۸۔ارمغانِ حجاز کے اردو حصے کا فارسی ترجمہ ۲۰۰۳ء، ۹۔ارمغانِ حجاز، ۲۰۰۳ء کا منظوم انگریزی ترجمہ۔ ۱۰۔ Iqbal Jorezaw, ۱۹۹۹ء، اور ۱۱۔ Iqbal Unwritten Books, ۲۰۰۲ء بھی علامہ اقبالؒ کے کلام کے انگریزی تراجم کا نام ہے۔ ۱۲۔ The Wounds Speak.1968، ۱۳۔ The Symphony of The Self(۲۸)

ان کے اردو نثر میں مضامین و تراجم، انگریزی میں طبع زاد نظمیں اور تراجم، انگریزی نثر میں مضامین کا بھی سراغ ملتا ہے۔اردو عربی اور فارسی میں کہی گئی نظمیں بھی موجود ہیں۔ان کے غیر مطبوعہ کلام اور تراجم پر مشتمل ایک غیر

مطبوعہ کتاب کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ان کا ایک پتہ گلی نمبر ۶ سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی ہے۔ان کا کلام تو ں نہیں مل سکا لیکن ان کی انگریزی، فارسی، اردو اور پنجابی ادب کے لیے خدمات قابل ذکر ہیں۔

صاحبزادہ سید رضی شیرازی (۱۹۲۱ء)

اصل نام صاحبزادہ نثار قطب اور مشہور نام رضی شیرازی ہے۔سید فدا حسین کے صاحبزادے اور پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی کے پوتے تھے۔ ۴ دسمبر ۱۹۲۱ء کو علی پور سیداں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل، ۱۹۴۶ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سیالکوٹ میں السنہ الشرقیہ کے معلم تعینات ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 پسرور میں تبدیل ہو کر آئے اور ۱۹۸۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔اردو اور فارسی کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے مگر فارسی کی طرف رجحان زیادہ تھا۔فن تاریخ گوئی میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔دوسروں کی تاریخ گوئی پر سخت گرفت کرتے تھے۔حلقہ احباب ذوق پسرور کے سرگرم رُکن تھے۔طاہر شادانی کے لاہور چلے جانے کے بعد حلقے کے صدر منتخب ہوئے اور کافی عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔ان کے اکلوتے بیٹے صاحبزادہ محمد عیاض قطب ریاض سعودی عرب میں الیکٹریکل انجینئر کے طور پر کام کرتے رہے ہیں (۲۹)۔

ضیاء محمد ضیاء (۱۹۲۸ء)

ضیاء محمد ضیاء قاسم آباد کُنجاہ میں ۱۲ فروری ۱۹۲۸ء کو حکیم عبدالرسول ولد نور حسین کے ہاں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مسجد سے حاصل کی۔ ۱۹۵۰ میں میٹرک اور ۱۹۵۴ء میں ایف اے کیا۔پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں منشی فاضل بھی کر رکھا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں اسلامیہ ہائی سکول کنجاہ گجرات سے ایک معلم کے طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا۔اسی سال گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 پسرور میں سرکاری ملازمت سے آغاز کیا۔ ۳۵ سال اس ادارے میں پڑھانے کے بعد ۱۲ فروری ۱۹۸۸ء کو ریٹائر ہوئے اور پھر اسی شہر کو مستقل سکونت کے لیے چُنا۔حلقہ احبابِ ذوق پسرور کے بانیوں میں سے ہیں۔گھر کے علمی ماحول نے اردو اور فارسی ادبیات کی طرف راغب کیا۔ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کی سوچ سے بڑی حد تک متاثر تھے۔وہ علامہ صاحب کو اپنا روحانی مرشد اور فکری رہنما تسلیم کرتے تھے۔رجحان زیادہ تر فارسی شاعری کی طرف تھا۔غزل کی بجائے نظم کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ان کا فارسی کلام ایران کے رسالوں میں بھی چھپتا رہا ہے۔فارسی نصاب میں بھی ان کی چند نظموں کے شامل ہونے دا پتہ چلا ہے۔ان کا مجموعہ ''نوائے شوق'' کے نام سے ایران کے ایک عالم محمد حسین

تسبیحی نے ۱۳۹۷ھ میں شائع کیا تھا جس کے ۱۹۶ صفحات تھے۔گمنام فارسی شاعروں کے بارے میں تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہے۔ پسرور کے قدیم شاعر دل محمد دلشاد پسروری کے فارسی دیوان کے حوالے سے مضمون لکھ کر مجلہ ہلال کراچی میں شائع کروایا۔زیرک کلانوری اور مثنوی ''ارژنگ عشق'' کو متعارف کروانے میں بھی ان کا کردار تھا۔اس مثنوی کے بارے میں لکھا ہوا اردو مضمون ڈاکٹر محمد باقر نے اپنی کتاب ''پنجابی قصے فارسی زبان میں'' میں شامل کیا(۳۰)۔اس طرح کے کئی کارنامے ان کے کھاتے میں درج ہیں۔

ضیاء محمد ضیاء چودہ پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگ پڑے تھے۔اردو،فارسی میں درجنوں کام کیے۔اردو اور میں کئی مجموعے ترتیب دیے۔ذیل میں ان کی کتابوں کی فہرست پیش ہے:

۱۔موجِ زمزم(اردو حمد اور نعت)،۲۔یادِ رفتگاں(اردو رثائی نظمیں)،۳۔کلامِ نفیس(مولوی الف دین نفیس کی شخصیت اور فن)،۴۔اقبالِ ایران(نامور اسکالر ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کی یاد داشتوں پر مشتمل کتاب)،۵۔اقبال عرفانی(نامور اسکالر ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کی یاد داشتوں پر مشتمل)،۶۔متاعِ سخن(اردو نظمیں،غزلیں اور قومی شاعری)،۷۔نوائے شوق(مجموعہ منظومات فارسی)،۸۔ارمغانِ عشق(نعتیہ کلام)،۹۔کاروانِ فارسی(مختصر مثنوی)،(۳۱)۱۰۔تسبیحی نامہ(ایک ایرانی دانشور کے ساتھ منظوم مخاطبہ)،۱۱۔موجِ صبا(ترتیب)فاخر ہریانوی کا مجموعہ کلام،۱۲۔حمد اور مناجات(حمدیہ نظموں کا انتخاب)،۱۳۔گلدستہ نعت(اردو کی بلند پایہ نعتوں کا انتخاب)،۱۴۔نوادراتِ سخن(اردو کے شعری لطائف و ظرائف)،۱۴۔گلدستہ سعدی(محمد حسین علوی کی تصنیف کی تصحیح اور نظر ثانی)،۱۵۔خزینۂ معارف(مصلحوں اور مفکروں کے اقوال)،۱۶۔تسہیل کلام اقبال(ارمغانِ حجاز کے فارسی حصے کا لفظی اردو ترجمہ)(۳۲)

ضیاء محمد ضیاء کی ساتویں سے دسویں تک چار کتابیں فارسی میں ہیں۔ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لیے انھوں نے نصاب کی کتابیں بھی ترتیب دی تھیں جن کا ذکر اس فہرست میں نہیں دیا گیا۔ان کا سارا کام اعلیٰ پایہ کا ہے۔ضلع سیالکوٹ میں فارسی ادب کی جب بھی بات ہوتی ہے،ان کو اعلیٰ مقام دیا جاتا ہے۔فارسی زبان و ادب کے حوالے سے ان کی کتابیں نوائے شوق،ارمغانِ عشق،تسبیحی نامہ اور کاروانِ فارسی ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ضیاء محمد ضیاء کی فارسی ادب کے لیے خدمات سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں:

عطاء قاضی (قاضی عطاء اللہ عطاء) (۱۹۳۴ء)

عطاء اللہ قاضی کا قلمی نام عطا قاضی ہے۔۱۵ جون ۱۹۳۴ء میں قاضی ظہور اللہ کے ہاں پسرور میں پیدا

ہوئے ۔میٹرک تک تعلیم پائی ،خطاط ہیں ،کئی کتابیں لکھیں ۔ان کی مندرجہ ذیل کتب ہیں:

شعرائے پسرور،سوزِ سخن،سازِ سخن،نیازِ سخن،اعجازِ سخن،نازِ سخن،شیرازِ سخن،امتیازِ سخن،فرازِ سخن،رازِ سخن،اعزازِ سخن،اعتزازِ سخن،سورۃ التوبہ(منظوم ترجمہ)،قرآنی دعائیں،سبحان اللہ سبحان اللہ،مفہوم القرآن،اشکوں کی لو۔

تحصیل پسرور کے رہنے والے یہ قلمکار کئی پہلوؤں سے قابل ذکر ہیں ۔ایک طرف تو یہ عالم دین ہیں تو دوسری طرف ایک شاعر بھی ،ایک طرف تو یہ ایک نعت نگار ہیں تو دوسری طرف ایک مفسر قرآن بھی ۔اپنے لگڑ نانا دل محمد دلشاد پسروری کی طرح انھوں نے بھی اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شاعری کی ہے ۔ذیل میں ان کا فارسی نمونہ کلام پیش ہے:

آشنا مار از اسرارِ حقیقت کردہ ای
بحر گرد و دشت پیمائ محبت کردہ ای

خاتم و خاتم تُرا آں ذاتِ حق فرمودہ است
کامل و اکمل تُوئی شانِ نبوت کردہ ای

چشمۂ حیوانِ حکمت ، بحرِ بی پایاں عِلم
سینہ ھا را مصدرِ عرفان و حکمت کردہ ای

صدرِ بزمِ انبیا و فخرِ تاجِ مُرسلاں
مرجعَ شاہ و گدا بزمِ رسالتؐ کردہ ای

انبیائ بزمِ عالم، اولیائ بحر و بر
ھمہ را روشن ز شمع نُورِ وحدت کردہ ای

می و ھسند حجر و شجر را مھر و مہ ذوقِ نمو
تازہ دلھا راز انوارِ بصیرت کردہ ای

ختم شُد بر نفسِ پاکش ھر جمال و ھر کمال
ماہ تا ماھی مطیعِ حُسنِ سِیرت کردہ ای(۳۳)

احمد(۱۷۸۵تا۱۸۲۹ء)

یہ بارہویں تیرہویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ان کے والد کا نام عبداللہ تھا اور یہ موضع لالو چندن معمور قصبہ پرسرُور کے رہنے والے تھے ۔احمد کے بھائی کا نام شیخ محمد اور دو بیٹوں کے نام محمد صدیق اور شیخ مطلوب درج ہیں ۔ انھوں نے فارسی انشا نگاری پر ایک کتاب ''مفتاح المطالب'' لکھی تھی جس کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مجموعہ آذر میں شمار نمبر ۲۸-۱ پر موجود ہے ۔یہ قلمی نسخہ ۱۶۵ صفحات پر مشتمل ہے ۔ یہ چار ابواب پر مشتمل ہے ۔ان میں زیادہ تر بادشاہوں اور دیگر اشخاص کی طرف سے دوسرے بادشاہوں اور علما و فضلا کو لکھے گئے خطوط شامل ہیں ۔ پہلے باب میں عادل شاہ والئ بیجاپور،جہانگیر،شاہ شجاع اور دارا شکوہ جیسے نام شامل ہیں جبکہ دوسرے باب میں مولوی رحمت اللہ و

عبداللہ پسران مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی اور نواب سعداللہ خان جیسے علماء اور فضلا شامل ہیں۔ تیسرا باب ''عرائض'' اور چوتھا باب ''اختتام وخطبہ'' ہیں۔ اس میں بہار کی تعریف میں لکھا گیا خط اور سیاہی بنانے اور خشک کرنے کے طریقے بھی درج ہیں۔ اس کتاب میں ایک مقام پر احمد صاحب یعنی شیخ احمد اپنے مولود ومسکن پُرسُرور (پسرور) کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''دارالسرُور چون دیدم کہ اہلِ فضل وقلم درمطالعۂ فن اِنشاءِ سخن طراز اں انجمن مقال وجادومنشاں محفلِ علم و افضال ترتیب میخایند'' (۳۴)

مشتاق احمد قریشی نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۷۸۵ اور وفات ۱۸۶۹ء لکھی ہے اور کتاب کا نام مفتاح المطالب لکھا ہے (۳۵)

دوست محمد صانع

اصل نام میر دوست محمد اور صانع تخلص تھا۔ پورا قلمی نام دوست محمد صانع لکھا ملتا ہے۔ ان کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کے بارے میں حسام الدین راشدی نے جو معلومات دی ہیں وہ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

''گل رعنا: میر دوست محمد، پدر میر محمد رائج سیالکوٹی

کہ ذکرش درحرف راء مہملہ بقلم آمد- بجودت طبع مشہور بود۔ گاہ گاہ فکر شعر می کرد: از منظومات اوست:

رنگ بیهوشئی دل، ریخته، از دست کسی ... می بخون جگر آمیخته، از دست کسی

بپای برق، هم نتوان رسیدن، در ح ... رہ دور و دراز است، ای کبوتر بال پر مشکن

شمع انجمن، صانع، میر دوست محمد، از زمرۂ سخن سنجان زمان بود، پدر رائج سیالکوٹی است،، از وی آمد: بپای برق۔۔۔الخ'' (۳۶)

ضیاء

صاحب تاریخ پسرور لکھتے ہیں کہ ضیاء محمد ضیاءؔ کے پاس ضیاء نامی شاعر کا ایک فارسی دیوان پڑا ہوا تھا جس کے چودہ صفحات ان کے پاس محفوظ تھے۔ ضیاء پسرور کے باشندے تھے اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں مل سکیں۔ ۱۸۵۶ء کے پسرور شہر کے خسرہ آبادی میں مکان نمبر ۳۱ کے ایک مکین ضیاء ولد فیض

قوم آرائیں کی نشاندہی ہوتی ہے(۳۷) عین ممکن ہے کہ یہ وہی شخص ہو۔آرائیوں کی تاریخ اور رسائل سے ان کا پتہ کیا جا سکتا ہے۔تاریخ پسرور میں ہے کہ"پسرور کے عبداللہ شوق (۷۰۔۱۹۰۴ء) اپنی ایک نظم میں ضیاء نامی شاعر کا ذکر کرتے ہیں ممکن ہے یہ وہی ضیاء ہوں:

اور حضرتِ ضیاءؔ کی ضیائیں تھیں چار سُو　　ملکِ ادب میں جن کی مسلّم تھی گفتگو(۳۸)

قاضی محمد عارف سیالکوٹی

قاضی محمد عارف مولانا غنی کاشمیری کے ہم عصر اور عہد شاہجہانی کے نامور شعرا میں سے تھے۔تاریخوں میں سیالکوٹی ہی کے نام سے مشہور ہیں۔مولانا جمال کے بیٹے قاضی ابوالقاسم کے بیٹے تھے۔ایک رباعی آپ کی یادگار ہے جو درج ذیل ہے:

خواهم که ازیں نشیب و پستی برهم　　وز ننگ خودی و خود پرستی برهم
یک جُرعه ز جامِ نیستی نوش کنِم　　از کشمکش خپمار هستی برهم(۳۹)

مولانا نادری

مولانا نادری کے بارے میں معلومات کم ہیں۔وہ نہایت عالم فاضل شخص تھے۔شاعری میں شہرتِ خاص تھی"نادری سیالکوٹی از نیکو فکران سیالکوٹ کہ مضاف صوبہ لاہور است نکات دقیقہ اش قابل خوض وغور"

آپ کی یادگار صرف ایک رباعی مل سکی ہے:

من بُودم و دوش یار سیمیں تن من　　جمعے ز نشاط و عیش پیراهن من
ایشاں همه صبحدم پرگنده شدند　　جُز خونِ جگر که ماند بر دامنِ من(۴۰)

عشرت

ڈاکٹر سید سلطان محمود نے تاریخ پسرور میں ایک مقام پر قلمی نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک فارسی شاعر کے قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے جس کا تخلص عشرت تھا۔پورا پیرا گراف یہاں درج کیا جاتا ہے:

"دوسرا قلمی نسخہ"نادر نامہ" ہے۔اس میں نادر شاہ کے حملہ ہندوستان کے مفصل حالات نظم میں لکھے گئے ہیں۔شاعر کا تخلص عشرت ہے اور وہ سیالکوٹ کا رہنے والا ہے،وہ حملے کے وقت لاہور سے اپنے بھاگنے کا بھی ذکر کرتا

ہے۔ ۱۰۰۳ھ میں احمد شاہ (۵۲۔۱۷۴۸ء) کے دورِ حکومت میں محمد سلطان شیریں سلطانپوری نامی کاتب نے اسے لکھا۔اصل نسخہ بوسیدہ اور خستہ ہونے کی وجہ سے ۱۳۲۷ء میں مولوی محمد شیر عالم کوٹ قادر بخش تارڑاں ضلع گوجرانوالہ نے ۲۹۳ صفحات پر خوش خط انداز میں دوبارہ نقل کیا۔۔۔ہر صفحہ پر ۱۴ فارسی اشعار ہیں۔۔۔اس نسخہ کے صفحہ نمبر ۲۶۳ سے ہم کو پتہ چلتا ہے کہ نادر شاہ دہلی سے واپسی کے وقت کلانور سے بہرام پور آیا۔بہرام پور سے وہ پسرور کے راستے سیالکوٹ گیا تھا(۴۱)۔

محمد اسلم

محمد اسلم سترہ سو سینتیس اڑتیس کے لگ بھگ محمد حفیظ ولد عبدالوہاب کے ہاں پسرور میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مقامی طور پر حاصل کی،بعد میں لکھنئو گئے اور فرنگی محل کے دارالعلوم سے مروجہ علوم حاصل کیے۔نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کے لیے ایک تذکرہ ''فرحت الناظرین'' ۱۱۸۴ھ میں ترتیب دیا۔اس تذکرے میں کہیں کہیں شاعر نے اپنے فارسی اشعار بھی نقل کیے ہیں۔اس میں ۳۶ مشائخ، ۳۲ علماء اور ۴۵ شعراء کا ذکر ہے۔ یہ سب علمی شخصیات شاہ جہاں اور اورنگزیب عالمگیر کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔مصنف نے اپنے اپنے، باپ، دادا، دادا کے بھائی اور پڑ دادا دادا ذکر بھی الگ الگ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ سب سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔بوڈلین ، کیمرج یونیورسٹی، برٹش میوزیم لائبریریوں کی فہارس میں اس کتاب دا ذکر موجود ہے جبکہ اس کا اردو ترجمہ پروفیسر محمد ایوب انصاری نے کیا جو کراچی سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ان کے ایک قصیدے کا مقطع پیش ہے جو انھوں نے نواب شجاع الدولہ کی مدح میں لکھا تھا:

خموش اسلمؔ ازیں گفتگو کہ در اقبال کراست زھرہ کہ باشد بوسی عدیل و سھیم(۴۲)

مندرجہ بالا شعراء کے علاوہ بھی اقبال قلندر کی دھرتی سیالکوٹ نے ایسے شعراء، ادباء اور علماء پیدا کیے ہیں جنھوں نے فارسی زبان و ادب کی بھرپور خدمت کی۔ان میں سے مولوی فیروز الدین فیروز ڈسکوی، مولانا عبدالرحمن خُلدی، محمد مقیم بن رحمت اللہ، مولوی الف دین نفیس، مولوی امام الدین ڈسکوی، امیر الدین نوشاہی، ضیاء المرتضے فاروقی، حکیم عبدالمجید پسروری، کریم بخش، محمد الدین عاصی، شاہد جعفری، مولانا محمد شریف کوٹلوی، قاضی محمد حسین، مستری نورالدین، نوراللہ شاہ قادری سیالکوٹی، درویش محمد یعقوب ہیبت پوری، حافظ حفیظ احمد قادری اور مضطر نظامی کے فارسی میں لکھنے کا سراغ ملتا ہے۔تھوڑی سی تلاش کے بعد امید کی جاسکتی ہے کہ نصف سے زیادہ کے تعارف اور کلام تک رسائی مل جائے گی۔اس

فہرست میں چند اور نام بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ان پر تحقیق کے بعد حاصل ہونے والا مواد ایک کتاب یا مضمون کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ان میں سے مضطر نظامی (۱۹۰۹ تا ۱۹۶۹) نے ''دانش کدہ'' (فارسی آموز) لکھی تھی جن کی طرف'' تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وھند کی چوتھی جلد'' میں اشارہ کیا گیا ہے۔چند تذکرہ نگاروں نے عہد جہانگیری کے ابو محمد سرابی سیالکوٹی، عہد شاہجہانی کے محمد اخلاص وامق سیالکوٹی، قاضی محمد عارف سیالکوٹی اور عہد عالمگیری کے شاہ خوش قاضی سیالکوٹی جیسے فارسی شعراء کا ذکر بھی کیا ہے۔ان کی تلاش کا کام بھی کل پر ڈال دیا گیا ہے۔اس خطے سے منسلکہ جموں و کشمیر میں تو اس سے بھی زیادہ فارسی کا چلن تھا۔سید حسام الدین راشدی کا کام اس حوالے سے تین ضخیم جلدوں پر محیط ہے۔اس مضمون میں چند ماہ میں جو ہاتھ لگا اختصار کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ایران اور دیگر علاقوں میں ہونے والے کام کا جائزہ لیا جائے تو مزید شعرا و ادباء کی دریافت کے ساتھ ساتھ درج بالا شعراء کی ذات اور خدمات کے بارے میں مزید معلومات بھی حاصل ہو سکتی ہیں :

حوالہ جات

☆ صدر شعبہ پنجابی، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج ڈسکہ ضلع سیالکوٹ

۱۔تاریخ ادبیات پاکستان مسلمانانِ پاکستان وھند، پانچویں جلد، فارسی ادب (سوم)، لاہور، گروپ کیپٹن فیاض محمود، ۱۹۷۲، ص 65

۲۔اقبال ڈار سیالکوٹی، میجر (ر)، مرتب و مشرح، ملک العلماء علّامہ عبدالحکیم سیالکوٹی مع تاریخِ سیالکوٹ و مشاہیر سیالکوٹ، اپریل ۲۰۱۳ء، ص ۹۶

۳۔اقبال ڈار سیالکوٹی، میجر (ر)، مرتب و مشرح، ملک العلماء علّامہ عبدالحکیم سیالکوٹی مع تاریخِ سیالکوٹ و مشاہیر سیالکوٹ، ص ۹۶

۴۔تاریخ ادبیات پاکستان مسلمانانِ پاکستان وھند، پانچویں جلد، فارسی ادب (سوم)، لاہور، ص ۳۹۳۔۳۹۵

۵۔عطاء پسروری، شعرائے پسرور، پسرور، اے۔یو۔زیڈ آفسٹ پرنٹرز، س ن، ص ۱۳

۶۔عطاء پسروری، شعرائے پسرور، پسرور، ص ۱۳

۷۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، تاریخ پسرور، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1981ء، ص ۱۹۷

۸۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، تاریخ پسرور، لاہور، ص ۱۵۵

۹۔عطاء پسروری، شعرائے پسرور، پسرور، ص ۳۳۳

۱۰۔مشتاق احمد قریشی و محمد ندیم قاسمی، آئینہ پسرور، پسرور، ادبی دائرہ، ۲۰۱۳ء، ص ۱۰۔۲۰۹

۱۱۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، تاریخ پسرور، لاہور، ص ۲۴۲

۱۲۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، تاریخ پسرور، لاہور، ص ۲۔۲۶۱

۱۳۔محمد صادق پسروری، تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' قصور، مرکزی مجلس امیر ملت پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۵

۱۴۔محمد صادق پسروری، تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' قصور،ص ۱۸تا۲۰

۱۵۔اکبر علی غازی، ڈاکٹر، پنجابی ادب دی روایت : سیالکوٹ وچ،قلمی،ص ۸۴

۱۶۔احمد جاوید، تسہیل وفرہنگ، تسہیل پیامِ مشرق، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۲ء،ص ۷۷۔۴۷۵

۱۷۔محمد صادق پسروری، تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' قصور،ص ۷۸تا۸۱

۱۸۔اکبر علی غازی، ڈاکٹر، پنجابی ادب دی روایت : سیالکوٹ وچ،قلمی،ص ۷۷۔۲۷۶

۱۹۔دیوانِ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، مترجم، خواجہ محمد شاہ الدین سروری قادری، سیالکوٹ، خواجہ شاہ الدین اکیڈمی، ۲۰۰۶ء،ص ۳۔۲۲

۲۰۔دیوانِ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، مترجم، خواجہ محمد شاہ الدین سروری قادری، سیالکوٹ،ص ۳۔۲۲

۲۱۔بوٹا سہیل سروری قدری، ملک محمد، مرتب، تذکرہ اولیاء، سیالکوٹ، خواجہ شاہ الدین اکیڈمی، 2007ء،ص 70

۲۲۔تاریخِ ادبیات پاکستان، پانچویں جلد، فارسی سوم، لاہور،ص ۶۶۴

۲۳۔محمد صادق پسروری، تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' قصور،ص ۹۴تا۹۶ ۲۴۔ عطاء پسروری، شعرائے پسرور، پسرور، ادبی سبھا، س ن،ص ۳۹

۲۵۔ایضاً،ص ۳۳۴ ۲۶۔تاریخ ادبیات پاکستان مسلمانانِ پاکستان وھند، پانچویں جلد، فارسی ادب (سوم)، لاہور،ص ۳۹۸۔۳۹۷

۲۷۔شاکر کنڈان، سرگودھا کا دبستانِ شاعری، جلد اول، لاہور، اکادمیات، ۲۰۱۲ء،ص ۳۶۔۱۳۳

۲۸۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، تاریخ پسرور، لاہور،ص ۸۔۲۷۶

۲۹۔ایضاً،ص ۵۱۔۲۵۰ ۳۰۔ایضاً،ص ۶۔۲۵۴ ۳۱۔ضیاء محمد ضیاء، متاعِ سخن، لاہور، مکتبہ اثبات، ۲۰۰۷ء،ص ۱۴۴

۳۲۔ضیاء محمد ضیاء، متاعِ سخن، لاہور، پچھلا سرورق ۳۳۔عطاء قاضی عطا، نازِ سخن، پسرور، ادبی سبھا، ۱۹۹۷ء،ص، ۱۱۲،ص ۶:۔۵۵

۳۴۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، تاریخ پسرور، لاہور،ص ۳۔۱۹۲

۳۵۔مشتاق احمد قریشی و محمد ندیم قاسمی، آئینہ پسرور، پسرور،ص ۱۰۔۲۰۹

۳۶۔حسام الدین راشدی، سید، تذکرہ شعرائے کشمیر، بخش دوم، کراچی، اقبال اکیڈمی، ۱۹۶۸ء،ص ۵۱۸

۳۷۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، تاریخ پسرور، لاہور،،ص ۲۵۴

۳۸۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، تاریخ پسرور، لاہور،ص ۹۵

۳۹۔اقبال ڈار سیالکوٹی، میجر (ر)، مرتب و مشرح، ملک العلماء علّامہ عبدالحکیم سیالکوٹی مع تاریخِ سیالکوٹ و مشاہیرِ سیالکوٹ، اپریل ۲۰۱۳ء، ص ۸۹

۴۰۔ایضاً،ص ۹۷ ۴۱۔سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید، تاریخ پسرور، لاہور،ص ۹۹

۴۲۔اوہی،ص ۱۹۔۲۱۶

نثری داستانی ادب میں اسلوبی میلانات و رجحانات

☆ڈاکٹر ثمینہ سیف ☆☆ڈاکٹر نسیمہ رحمٰن

Stylistic Similarities and Trends in Urdu Dastani (Prose) Literature

Dr. Samina Saif/Dr. Nasima Rehman

Prose narrative of Urdu literature originated in Deccan in the eighteenth century. The characteristics and styles of the early dastaani literature were hugely influenced by Persianism, these stories with rhyming and poetic styles were in fact the foundations of"Bagh o Bahar″ and "Fasana e Ajaib".Dastaani Adab is decorated with diverse and colorful styles, in which charm is present to the highest degree. For instance, comprehensibility in"Bagh o Bihar″ and"Nau Ain e Hindi″, elegance and rhythm in"Fasana e Ajaib″ and"Nu Tarz e Murassa″, primeval and ornamented styles in"Nauratan″ and"Gulshan e Nau Bahar″.Moreover, ″Rani Ketki ki Kahani″, ″Betaal Pachesi″ and"Shakuntala″ show glimpses of fusion of Hindi traditions while"Jazab e Ishq″ and"Araish e Mehfil″ display Persian culture. Diverse trends of linguistic dastaani adab

has developed it into the basis of modern prose genres of Urdu literature.

Key words: Dastani literature, Linguistics, Persianism, Allegory, Style, Formative stages, Modernity, Hindi traditions

خلاصہ : اُردو کی نثری داستانوں کی ابتدا اٹھارھویں صدی میں دکن سے ہوئی۔ابتدائی داستانی ادب کے خدوخال اور اسلوب پر فارسیت کا رنگ چھایا رہا، مقفیٰ و مسجع اسلوب کی حامل یہ داستانیں درحقیقت وہ بنیادیں تھیں جن پر بعدازاں ''باغ و بہار'' اور ''فسانہ عجائب'' کے ایوان تعمیر ہوئے۔ داستانی ادب میں متنوع اور رنگارنگ اسالیب کا میلہ سجا ہوا ہے جس کے دامن میں دلکشی اور ادبیت بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔مثلاً ''باغ و بہار'' اور ''نو آئین ہندی''، سلاست اور سادگی، ''فسانہ عجائب'' اور ''نوطرز مرصع'' میں مرصع کاری، ''نورتن'' اور ''گلشن نوبہار'' میں مرجز اور رنگین اسلوب، ''رانی کیتکی کی کہانی''، ''بیتال پچیسی'' اور ''شکنتلا'' میں ہندی روایتی اسلوب اور ''جذبِ عشق'' اور ''آرائش محفل'' میں مفرس اسلوب کے امتزاج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ داستانی ادب میں اسالیب کے متنوع تجربات اور رجحانات نے عصر حاضر کی نثر کو پروان چڑھایا ہے، یوں یہ داستانیں تمام جدید نثری اصناف کی بنیاد گزار ہیں۔

کلیدی الفاظ : اسالیب بیان، روایتی انداز، تمثیل، رنگین بیانی، سلاست، رعایت لفظی، رنگارنگی، واقعیت، ارتقائی مراحل۔

ایک ترقی یافتہ اسلوب صدیوں کے تہذیبی و تدریجی ارتقا کا رہین منت ہوتا ہے۔اسے بارہا مقامات پر نشیب و فراز اور آزمائشوں سے گزرتے ہوئے عروج نصیب ہوتا ہے۔اُردو کے نثری داستانی ادب کے اسالیب کا کینوس بہت وسیع اور پھیلا ہوا ہے جو کہ عہد بہ عہد تغیرات سے گزرتا ہوا ارتقائی منازل طے کرتا گیا۔جملوں کی ساخت، عبارت کی ترکیب اور الفاظ کا انتخاب و استعمال کسی بھی فن کے اسلوب کے لازمی اجزا ہیں اور جب زبان پختہ و بالیدہ ہو کر ادائے مطالب ادا کرنے پر قادر ہو جاتی ہے تو اسلوب کا ظہور و ورود ہوتا ہے۔اُردو نثر کی ابتدا تصوف کے رسالوں اور داستانوں سے ہوئی۔صوفیائے کرام کا مقصد تو مذہبی خیالات کا پرچار کرنا تھا، جب کہ کہانی کے روایتی انداز اور اسلوب کی منظم شکل داستانی ادب میں بتدریج تشکیل پاتی گئی۔مذہبی رسائل کے برعکس داستانوں میں چاشنی، روانی اور سلاست کی ضرورت تھی تاکہ ایسا اسلوب بن سکے جو عوام میں مقبول اور دل آویز بھی ہو۔

اُردو کی اولین نثری داستان ملا اسد اللہ وجہیؔ کی ''سب رس'' (۱۶۳۵ء) جو فارسی نثری تصنیف ''دستور

العشاق'' از یحییٰ ابن سلیک فتاحی نیشاپوری کا آزاد ترجمہ ہے، انھوں نے اسے نثر اور مثنوی دونوں صورتوں میں لکھا۔ دکن میں لکھی گئی ''سب رس'' کی نثر میں قافیہ پیمائی، مسجع عبارت، جملوں کی دلکش بناوٹ اور لفظی و معنوی رعایت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ وجہی نے فارسی، سنسکرت، دکنی، ہندی، عربی اور مرہٹی الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے اُردو نثر کا شاہکار بنایا جس میں ادبیت کے علاوہ ایک مخصوص فکر کو باقاعدہ منصوبے اور بڑے التزام و اہتمام کے ساتھ برتتے ہوئے اُردو نثر کو فارسی نثر کی سطح تک لایا گیا۔ اسی لیے وجہی کو اُردو نثر کا باوا آدم کہا گیا۔ ''سب رس'' کے اس نئے اسلوب کی بنیاد رکھتے ہوئے وجہی خود کہتے ہیں:

''آج لگن اس جہاں میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں، اس لطافت، رس چھنداں ہوں۔ نظم ہور نثر گلا کر نہیں بولیا۔ اس بات کوں اس نبات کوں یوں کوئی آب حیات نہیں گھولیا۔ یوں غیب کا علم نہیں کھولیا۔۔۔۔ دانش کے تیشے سوں پہاڑ اں الٹایا تو یو شیریں پایا تو یو نوی باٹ پیدا ہوئی۔۔۔۔ یو عجب نظم ہور نثر ہے، جانو بہشت میں کا قصر ہے۔ سطر سطر پر برستا ہے نور، ہر یک بول ہے یک حور''[1]

''سب رس'' جس عہد میں لکھی گئی اُس وقت شاعری اور رنگین بیانی کو عروج حاصل تھا، اسی لیے وجہی نے مقفّٰی و مسجع عبارت سے اپنے اسلوب کو رنگین اور دلکش بنایا۔ اس نے کمال خوبصورتی سے نثر میں شعری آہنگ پیدا کرنے کے لیے فارسی نظم کے برخلاف چھوٹے جملے لکھے، اس سے نثر میں شعری آہنگ اور ترنم تو آ گیا مگر بات چیت کا سا لہجہ اور انداز بھی در آیا۔ ''سب رس'' میں نہ صرف پر تکلف اسلوب کی بنا ڈالی گئی ہے بلکہ یہ اپنے طرز کے اعتبار سے انشاء پردازی کا پہلا کامیاب نقش بھی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر سید عبداللہ نے وجہی کو زبان تراش اور اس کے اسلوب کو ترقی یافتہ قرار دیتے ہوئے اسے ''دکنیت'' اور ''ہندوستانیت'' کا امتزاج جان کر شمالی ہند اور جنوبی ہند کا ہمہ گیر اسلوب کہا ہے۔''[2]

''سب رس'' ایک تمثیل ہے، تمثیل دراصل ایک اسلوب کا نام ہے کسی صنف سخن کا نہیں۔ یوں کرداروں کی زبانی لمبی چوڑی پند و موعظت کی تقریریں بیان کرتے ہوئے انشائیہ نگاری کی روایت کی بنا ڈالی گئی۔ غرض یہ کہ ''سب رس'' میں نہ صرف افسانوی، تمثیلی اور انشائیہ نگاری کے اسلوب کو برتا گیا بلکہ مقفّٰی و مسجع اور شمالی و جنوبی ہند کا مرکب ہمہ گیر اسلوب متشکل ہوا۔ وجہی ایک نابغہ تھا جس نے ایسا اسلوب ایجاد کیا کہ جس کی بدولت اُردو نثر بیک جست کئی منزلیں طے کرتے ہوئے ''ادبی نثر'' کے رتبہ پر فائز ہوئی اور ''سب رس'' اپنے طرز ادا کی بدولت اُردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل قرار پائی۔

اٹھارھویں صدی میں شمالی ہند کی ایک اہم داستان عیسوی خاں بہادر کی ''قصہ مہر افروز و دلبر'' ہے۔ جس کا قصہ زوال پذیر مغلیہ تہذیب کا نگار خانہ ہے۔ مصنف کا تخیل یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے قلعے و دربار سے گہری وابستگی ہے۔ قصے میں آسان فہم، سہل اور دلچسپ اسلوب بیان ہے۔ مافوق الفطرت عناصر اور مافوق الفطری رویوں کی کارفرمائی کو اُردو اور ہندی کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تشبیہات و استعارات اور تلمیحات و اساطیر پر ہندی کا اثر نمایاں ہے۔ عیسوی خان بہادر نے داستان میں بسا اوقات بناؤ سنگھار میں اس انداز سے مبالغہ آرائی کے بیان شامل کیے ہیں کہ مزاح کی ہلکی سی جھلک پیدا ہوتی ہے۔ نیز مصنف ''اور اور'' کی تکرار سے فقروں کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے تحریری انداز کے بجائے تقریری انداز بیان کو فروغ دیتا ہے۔ ''قصہ مہر افروز و دلبر'' میں مزاحیہ اسلوب اور تقریری انداز بیان کی اولین جھلکیاں موجود ہیں۔ عیسوی خاں بہادر کی ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کو اُردو داستانی اسلوب کے ارتقائی حوالے سے صرف تاریخی اہمیت حاصل ہے، اس میں وہ متاثر کن خصوصیات موجود نہیں ہیں کہ جس کی بدولت ہم اسے ''سب رس'' کی اگلی کڑی کہہ سکتے۔

''سب رس'' کے بعد داستانی اسلوب کی ایک اہم کڑی ''نوطرز مرصع'' (۱۷۷۵ء) از میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ ہے۔ سترھویں صدی میں جو اہمیت ''سب رس'' کو اُردو نثری داستانی اسلوب میں حاصل ہے وہی اہمیت اٹھارھویں صدی میں ''نوطرز مرصع'' کو حاصل ہے۔ تحسینؔ فارسی کے شاعر، نثار اور خوش نویس تھے۔ ''نوطرز مرصع'' کا قصہ فارسی داستان ''قصہ چہار درویش'' سے ماخوذ ہے۔ تحسینؔ کا طرز بیان اولاً تو فارسی اور عربی الفاظ سے پُر ہونے کی وجہ سے مقفیٰ، رنگین، پرتکلف اور مشکل ہے۔ ثانیاً نواب شجاع الدولہ کی فرمائش پر لکھے جانے کی وجہ سے رعایت لفظی اور صنائع لفظی و معنوی کا خاص خیال رکھتے ہوئے انشا پردازی کے جوہر دکھانا مقصود تھا، ثالثاً اس دور میں مرصع سازی کی روایت مقبول تھی۔ یوں تحسین نے ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں جملوں کی ساخت اور بناوٹ پر فارسیت کا غلبہ ہے۔ لیکن تیسرے درویش کی داستان کے آتے ہی اسلوب اچانک سے رواں، جملے سادے، رنگینی اور تصنع غائب اور فارسی تشبیہات و استعارات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی[۳] اور شہناز انجم[۴] نے تحسینؔ کے اسلوب کو گنگا جمنی اسلوب قرار دیا جس میں سلاست کی جھلکیاں اور رنگین بیانی کے نمونے بیک وقت دکھائی دیتے ہیں۔ نیز سلیس و دقیق، سہل و مشکل اور فارسی و عربی کی تراکیب کے ساتھ ہندی الفاظ کی رنگارنگی بھی موجود ہے۔

''نوطرز مرصع'' کے بعد شاہ عالم آفتاب ثانی کی داستان ''عجائب القصص'' (۱۷۹۲ء) اپنے طرز ادا کے اعتبار

سے قابل ذکر ہے۔ ''نوطرز مرصع'' کے بعد عام فہم اسلوب لکھا جانا ایک اچنبھے کی بات ہے۔ یہاں داستانی ادب کے عہد طفولیت میں ہی سلیس اسلوب اور قافیہ پیمائی وعبارت آرائی سے حتی الوسع باز رہنے کے رجحان کو تقویت دی گئی۔ الغرض ''عجائب القصص'' میں اُردو اسلوب نے فارسی اسلوب سے رشتہ منقطع کرتے ہوئے خالص اُردو اسلوب کی ساخت، تراکیب اور طرز استعمال کو اپنایا۔ بلاشبہ ہر زبان کا اپنی تہذیب سے بالواسطہ تعلق ہوتا ہے اور زبان کی ترکیب نحوی اور جملوں کی ساخت اس کی تہذیب کے چشموں سے پھوٹتی ہے۔ فارسی زبان پر جب عربی زبان کا اثر پڑا تو اس کے جملوں کی ساخت بدل گئی اور یوں عربی تہذیب کا دھارا فارسیت میں بہنے لگا۔ بالکل ایسے ہی جب مسلم حکمرانوں کے دور میں ہندوستان میں فارسی رواج پائی تو اس کے اثرات ''سب رس'' اور ''نوطرز مرصع'' میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ ''عجائب القصص'' میں اُردو پن غالب ہے۔ اس کے جملوں کی ساخت پر عربی اور فارسی کا اثر بھی موجود ہے اور اس کا اپنا ایک دیسی مزاج بھی ہے۔ ''نوطرز مرصع''، ''سب رس'' اور ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کے برعکس اس داستان میں اسلوب کا ایک اور ہی امکان موجود ہے جو مستقبل میں پروان چڑھتے ہوئے داستانی اسلوب کی راہیں متعین کرتا ہے۔ درحقیقت ''''نوطرز مرصع'' کی نثر میں ڈوبتے سورج کا اور ''عجائب القصص'' کی نثر میں چڑھتے سورج کا حسن ہے۔''[۵]

اٹھارویں صدی کی آخری دہائی میں مہر چند کھتری کی ''نوآئین ہندی'' (۹۴۔۱۷۹۳ء) اپنی سلاست، سادہ بیانی اور عام فہم اسلوب کی وجہ سے اُردو داستانی ادب کا اہم سرمایہ ہے۔ مہر چند کھتری نے اسلوب میں جدت لاتے ہوئے اسے معیاری اور ادبی بنایا، تکلف اور تصنع سے عاری اس اسلوب میں فارسی تراکیب اور نامانوس الفاظ بہت کم ہیں۔ غرض یہ کہ یہاں اسلوب میں انشا پردازی کے برعکس سادگی اور سلاست کے وہ معیار اور اصول ملتے ہیں جنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں فروغ پایا۔ فورٹ ولیم کالج جسے سلیس نثر اور سادہ اسلوب کا بانی قرار دیا جاتا ہے، درحقیقت اس نثر اور اسلوب کی داغ بیل تیس چالیس سال قبل مہر چند کھتری ڈال چکے تھے۔ شمالی ہند میں شاہ حسین حقیقت بریلوی نے ''جذبِ عشق'' کے عنوان سے ایک داستان لکھی۔ ''نوطرز مرصع'' کی طرح اس کے اسلوب میں بھی فارسی نحو رچا بسا تھا۔ مصنف نے رنگین نثر سے سروکار رکھا۔

اٹھارھویں صدی کے داستانی اسلوب پر فارسی کا غلبہ چھایا رہا مگر انیسویں صدی بہت اہمیت کی حامل ہے، اس عہد میں سادہ و سلیس اور عام فہم اسلوب رائج ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں داستانوں کا پلڑا بھاری رہا اور زیادہ تر داستانیں آسان اسلوب میں فارسی سے ترجمہ ہوئیں۔ کالج کی داستانوں میں حیدر بخش حیدریؔ کی ''توتا کہانی''

(۱۸۰۱ء) اور ''آرائش محفل'' (۱۸۰۱ء) کو اولیت حاصل ہے۔ حیدریؔ کا شمار اُردو داستانی نثر میں سادگی اور سلاست کے محسن کے طور پر ہوتا ہے، ''توتا کہانی'' کا اسلوب دبستان دلی کی سادگی اور دبستان لکھنو کے روز مرہ اندازِ نگارش کے مرکب سے پروان چڑھتا ہے۔ جس میں ہندی اور فارسی الفاظ توازن سے رواں دواں ہیں اور داستان گو نے تصنع اور لفاظی سے اجتناب کرتے ہوئے اسلوب کو ثقیل اور گنجلک ہونے سے بچایا ہوا ہے۔ فارسی سے ترجمہ کی گئی داستان میں فارسی ترکیبیں آنا فطری امر ہے مگر یہ تراکیب عصر حاضر کے قاری کو بیگانی نہیں لگتیں بل کہ اُردو کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے فارسی تراکیب و محاورات سے فصاحت اور ہندی کی چاشنی سے سلاست پیدا کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کا یہ خیال دُرست ہے:

> ''حیدری نے اردوئے معلی کی بول چال میں کتابی فارسی کا شائستہ انداز اس طرح سمو دیا ہے کہ دونوں یک جان ہو گئے ہیں۔۔۔۔ یہ کام اُردو نظم میں میر تقی میرؔ نے سرانجام دیا تھا اور نثر میں حیدری نے اس کی سعی کی ہے اور کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔''[۶]

''آرائش محفل'' میں قدیم فارسی اسلوب کی شاعرانہ رنگ آمیزیاں اور رنگین عبارت آرائیاں بہت کم ہیں۔ حیدریؔ جدت طراز اور مستقبل شناس تھا، اس نے ایسا سادہ اسلوب ایجاد کیا جس کی بنیاد پر اُردو نثر کی عمارت کھڑی ہے۔ حیدریؔ نے منظر کشی، جزئیات نگاری اور معاشرتی بزم آرائیوں کی پیش کش میں قدیم داستانی اسلوب کی ڈگر سے ہٹ کر طوالت کے بجائے اختصار پسندی کا راستہ چُنا ہے۔

محمد خلیل علی خاں اشکؔ نے گلکرسٹ کی فرمائش پر ''داستانِ امیر حمزہ'' (۱۸۰۱ء) لکھی، یہ داستان محض چند قصوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ سحر القصص ہے۔ اشکؔ کے اسلوب میں سادگی اور ادبیت جھلکتی ہے۔ ''بیتال پچیسی'' (۱۸۰۱ء) اور ''مادھونل اور کام کندلا'' (۱۸۰۱ء) کو مظہر علی خان ولاؔ نے سنسکرت سے اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے اردو میں نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ ''بیتال پچیسی'' میں رامائن، پرانوں، مہا بھارت، ہندی اساطیر اور دیومالائی عناصر کو بیان کرتے ہوئے اس کے اسلوب میں ہند ایرانی کلچر اور اسلامی تہذیب و تمدن خندہ جبینی سے ملے ہوئے ہیں جس میں انسانی باطن کو زیست کے آفاقی و بنیادی متنوع موضوعات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ اس اُردو داستان میں بھاشا کے الفاظ شامل کرنے سے نغمگی کا آہنگ بھی متاثر ہوا ہے۔ ڈاکٹر مجید بیدار نے برج بھاشا اور سنسکرت کے مرکب اس اسلوب کو ''ہندوستانی بیانیہ'' کا نام دیا ہے۔[۷] فورٹ ولیم کالج میں تو یہ منفرد اور انوکھا اسلوب اتنا پنپ نہ سکا مگر بعد ازاں منشی پریم

چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور سدرشن کے افسانوں نے اس پیرائے اظہار کو جلا بخشی۔ ''مادھونل اور کام کندلا'' میں ولؔا نے قافیہ پیمائی اور رنگین بیانی سے اپنے اسلوب کی حنابندی کی ہے۔

''سنگھاسن بتیسی'' (۱۸۰۱ء) مرزا کاظم علی جوان اور للولال جی کی مشترکہ کاوش ہے۔ سنسکرت سے ترجمہ شدہ اس داستان کی 32 کہانیاں راجہ بکرم اجیت کے گرد گھومتی ہیں۔ ان کہانیوں میں ہندی، سنسکرت، برج بھاشا اور اُردو کو باہم ملا کر ایک جُدا اسلوب متعارف کروایا گیا ہے۔ کاظم علی جوانؔ نے ''شکنتلا'' (۱۸۰۱ء) میں ''بیتال پچیسی'' اور ''سنگھاسن بتیسی'' کی طرح اسلوب میں عربیت اور فارسیت کی اثر پذیری کم کرتے ہوئے برج بھاشا اور ہندی روایات کو داخل کر کے دو قسم کے طرزِ اسلوب کو ہوا دی۔ یوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بیگانگی کا بیج بویا گیا جس نے آگے چل کر اُردو ہندی، جیسے ذولسانی تفریق کی بنیاد رکھی۔ ''بیتال پچیسی'' اور ''سنگھاسن بتیسی'' کے مقابلے میں ''شکنتلا'' کے مصنف کے اسلوب میں نہ تو داستانی دل کشی ہے اور نہ ہی ڈرامائی دلچسپی۔

فورٹ ولیم کالج میں میر امن نے ''باغ و بہار'' (۱۸۰۲ء) جیسی لازوال اور بے مثال داستان لکھی۔ ''باغ و بہار'' کی مقبولیت کا راز اس کے اسلوب میں پنہاں ہے۔ لطافت و ہم آہنگی اس اسلوب کی جان ہیں، جہاں واقعات بڑے تسلسل سے زبان کے چٹخارے اور محاوروں کی بے ساختگی کی پیوند کاری سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ یہ اسلوب ایسا ہشت پہلو نگینہ ہے جس میں خوش بیانی، جمالیاتی احساس، تخیل کی بلندی، زبان کی حلاوت، فنی رچاؤ، پختگی، تہہ داری اور لطافت و شیرینی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید حسن خاں نے ''باغ و بہار'' کو جدید اُردو نثر کا پہلا صحیفہ کہا ہے۔ ۸ تو ڈاکٹر سہیل بخاری نے اسے اُردو کا زندہ جاوید معجزہ قرار دیا ہے۔ ۹ جب کہ گیان چند جین نے اس اسلوب کو باعث فخر اور لا ثانی جانا ہے۔ ۱۰ اور سید احتشام حسین کی یہ رائے ہے کہ ''میر امنؔ کی باغ و بہار ان تصنیفات میں سے ہے جو ایک بار پیدا ہو کے پھر نہیں مرتیں۔'' ۱۱ الغرض ''باغ و بہار'' کو جو مقبولیت اور شہرت اپنے سادہ، آسان اور سلیس اسلوب کے سہارے ملی اس کی گرد کو بھی فورٹ ولیم کالج کی کوئی دوسری داستان نہ پا سکی۔

میر بہادر علی حسینیؔ نے مثنوی ''سحر البیان'' کو اُردو نثر میں ''نثر بے نظیر'' (۱۸۰۲ء) کی صورت میں منتقل کیا۔ حسینیؔ کو میر امن کے برعکس مسجع عبارت لکھنے کا شوق تھا جس سے ان کے اسلوب میں روانی متاثر ہوئی اور عبارت میں بوجھل پن، بے ربطی اور ثقالت جیسی خامیاں در آئیں۔ ''اخلاق ہندی'' (۱۸۰۲ء) کو بھی حسینیؔ نے فارسی کتاب ''مفرح القلوب'' سے اُردو ترجمہ کیا۔ ''اخلاق ہندی'' کے تمثیلیہ اندازِ اسلوب کا چراغ بھی ''باغ و بہار'' کی مقبولیت کے آگے نہ چل

سکا۔ فورٹ ولیم کالج میں سادگی اور روانی کو اسلوب میں اپناتے ہوئے شیخ حفیظ الدین احمد نے ''خرد افروز'' (۱۸۰۳ء) لکھی۔ پند و موعظت اور سنجیدگی کے باوجود یہ اسلوب تخیل اور جمالیاتی حسن کا حسین امتزاج ہے۔

نہال چند لاہوری نے ''مذہبِ عشق'' (۱۸۰۳ء) میں گل بکاؤلی کا قصہ فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ داستان میں قصے کی دلچسپی کو اسلوب پر فوقیت حاصل ہے۔ مصنف کا اسلوب ثقیل ہے جو کسی طرح سے بھی میر امن اور حیدر بخش حیدریؔ کے اسلوب سے لگا نہیں کھاتا ہے۔ ان معروف داستانوں کے علاوہ چند داستانیں ایسی بھی لکھی گئیں جن کو زیادہ پذیرائی نہ مل سکی، ان میں ''گلزار چین'' (۱۸۰۵ء) از محمد خلیل علی خاں اشکؔ اور بینی نرائن جہاںؔ کی ''چار گلشن'' (۱۸۱۰ء)، ''گل وصنوبر'' (۱۸۰۳ء) اور ''باغ عشق'' (۱۸۲۴ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ امر غور طلب ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا داستانی ادب اپنے پرکشش اسلوب اور معیاری انداز بیان کی بدولت مشہور ہوا۔ یہاں اسلوب میں رومانیت، تخیل اور واقعیت کے جلو میں برج بھاشا کے اثرات بھی شامل ہوئے، ہندی اسلوب کی رنگ آمیزیاں بھی جھلکتی ہیں اور معرب ومفرس اسلوب کی آمیزش بھی رواں دواں ہے۔ سلاست وسادگی کے ساتھ ساتھ صنائع و بدائع اور مشکل پسندی کو بھی ترک نہیں کیا گیا۔ یوں یہاں بیک وقت سادہ، آساں، عام فہم، سلیس و رواں اسلوب اور ثقیل، گنجلک، مبہم، مرصع و مسجع متنوع اسالیب کے نمونے ملتے ہیں۔

بیرون فورٹ ولیم کالج لکھنو، رام پور اور دہلی میں بھی متعدد داستان گوؤں نے اسلوب کے نئے نئے تجربات کیے، اس ضمن میں انشا اللہ خان انشاؔ نے اپنی طبع زاد داستان ''کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی'' (۱۸۰۳ء) میں عربی و فارسی اسلوب ترک کرنے کا دعوی کرتے ہوئے جدت پسندانہ اور جرات رندانہ کوشش کر کے ایک نیا تجربہ کیا۔ اس داستان میں ہندوستانی معاشرت، ہندی تخیل اور مشاہدے کا رنگ بہت گہرا ہے، بلاشبہ انھوں نے ہندی الفاظ، روایات اور تلمیحات کا استعمال اپنے معاصرین کی نسبت زیادہ کرتے ہوئے داستان کو نادر شاہکار بنایا۔ یہی ہندی تہذیب و روایات کا رنگ بعد میں نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں ملتا ہے۔ نیز انشاؔ نے ایک اور غیر منقوط داستان ''سلک گوہر'' (۱۸۰۰ء) لکھتے ہوئے اپنی لیاقت تو دکھائی مگر اسلوب کے حوالے سے اسے بوجھل اور ثقیل بنا دیا۔

محمد بخش مہجور نے ''گلشن نو بہار'' (۱۸۰۵ء) میں مرجز اور رنگین اسلوب سے کام لیا۔ اسی طرح انھوں نے ''نورتن'' (۱۸۱۴ء۔ ۱۸۱۳ء) میں رعایت لفظی اور قافیہ پیمائی سے اسلوب کو لفاظی اور شعری رنگ آمیزی سے پُر کیا۔ مثلاً ''نورتن'' میں ایک جگہ مہجور کا طرزِ نگارش ملاحظہ ہو جس میں مسجع عبارت اور شاعری کو باہم ملایا گیا ہے۔

''بادشاہ جم جاہ کو اُس سوداگر خوش منظر سے اس قدر محبت بہم پہنچی کہ اگر اس کے متاع حسن کو دیدۂ میزان میں ایک روز نہ وزن کرتا تو جنس بےقراری کا نرخ بڑھ جاتا بلکہ سودا پورا ہو جاتا اور آٹھ پہر ھنگامہ بازارشوق مافوق کا گرم رہتا:

غرض ایسی بڑھی دونوں میں الفت کہ رہے تھے ہمیشہ بے کدورت

کبھی اُس پاس وہ شہ آپ جاتا کبھی اپنے بھی گھر اس کو بلاتا'' ۱۲؎

ڈاکٹر آرزو چودھری کے مطابق ''یہ اسلوب بلاشبہ وجہی کا خاص انداز ہے۔ جسے مہجور نے پونے دو سو سال بعد ندادی۔''۱۳؎ مجموعی طور پر مہجورؔ نے داستانی اسلوب میں نظم کو نثر کے ساتھ شیر وشکر کرتے ہوئے اپنے دور کی ترجمانی کی جس میں رعایت لفظی اور رنگین بیانی کا عمل دخل تھا۔ بیرون فورٹ ولیم کالج پر تکلف و رنگین اور مرصع و مسجع اسلوب سے مزین رجب علی بیگ سرورؔ کی داستان ''فسانہ عجائب'' (۱۸۲۴ء) اپنے طرز بیان کے اعتبار سے دبستان لکھنو کی نمائندگی کرتی ہے۔ سرورؔ کا عہد شعر وسخن میں اوج پر تھا اور دوسرا ان کا شعور کلاسیکی رجحانات کی طرف مائل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے میر امنؔ کے اسلوب کا مذاق بھی اُڑایا ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے کلیم الدین احمد کو ''فسانہ عجائب'' شعر اور نثر دونوں کی خوبیوں سے خالی لگی۔ ان کے مطابق ''فسانہ عجائب'' کا اسلوب رنگ آمیزی، پر تکلفی، کہنگی، بد سلیقی اور بد مذاقی کی بہترین مثال ہے۔ جس میں صفائی اور سبکی کے بدلے ثقالت ہے۔ ۱۴؎ انھی خیالات کی تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری ۱۵؎ اور سید رفیق حسین ۱۶؎ نے ''فسانہ عجائب'' کے اسلوب کو دقیق، غیر متوازن، بے لطف، بوجھل اور گراں کہا۔ درحقیقت سرورؔ کے اسلوب کی پیچیدگی اپنے عہد کی علمیت کا ثبوت ہے، دراصل ہماری داستانوں کا اسلوب انتہائی روایتی اور لفظی بندشوں سے وابستہ رہا ہے۔ اسی لیے داستان گو آرائش زبان کا خیال رکھتے ہوئے اپنے اسلوب کو لفظوں کی رنگینیوں اور تراکیب کی بندشوں میں جکڑ کر مفہوم کی ادائیگی درست انداز سے نہ کر پاتا تھا۔ اسی روش کی کارفرمائی محمد بخش مہجورؔ اور رجب علی بیگ سرورؔ کے اسالیب میں جلوہ گر ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ اسلوب گراں گزرتا ہوگا مگر اپنے عہد میں یہی پسندیدہ اسلوب تھا جس کے بغیر نثر نگار لقمہ بھی نہ توڑ سکتے تھے۔

''داستانِ امیر حمزہ'' جنگ، عشق اور مذہب کے تانے بانے سے بُنی ہوئی ایک ایسی ادبی روایت ہے جو عرب، ایران اور ہندوستان کی فضاؤں میں صدیوں سے نمو پاتی رہی، اس کو کسی ایک کتاب، کسی ایک مصنف، کسی ایک زمانے یا مقام کی حدود میں مقید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فارسی میں یہ داستان اتنی طویل نہیں ہے جتنی کہ اُردو میں ہے۔ مذکورہ داستان کو ہندوستان میں اُردو ترجمہ کرنے کی ابتدائی کوشش فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں اشکؔ نے کی۔

اس کے بعد غالب لکھنوی نے اس داستان کا ترجمہ کیا۔ بعد ازاں یہ داستان نول کشور پریس کے تحت رام پور میں متعدد داستان گوؤں کے ہاتھوں ۴۶ جلدوں کے ایک ضخیم سلسلے کی صورت میں تالیف ہوئی۔ ان داستان گوؤں میں تصدق حسین، محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر کے اسالیب قابل ذکر ہیں۔ داستان میں متنوع اسالیب بیان کی موجودگی نے اس کی زبان کو بھی غیر یکساں بنایا ہوا ہے۔

اسلوب میں محمد حسین جاہ کو رنگینی مرغوب کرتی ہے تو تصدق حسین کو سادگی و پرکاری جب کہ احمد حسین قمر توازن و اعتدال کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ طبیعتوں کی رنگارنگی نے اس داستان کے اسلوب کو ایک ایسا وسیع گلستان بنایا ہے جس میں الفاظ و تراکیب کے دل کش پھول بھی ہیں اور نادر تشبیہات و استعارات کے خوبصورت بیل بوٹے بھی۔ تکلف اور طمطراق ہماری تہذیب کی امتیازی صفت رہی ہے اور اس صورت میں ایسے داستان گو بھی تھے جنھیں نثر میں سادگی کے بجائے مرصع کاری عزیز تھی۔ نثر میں مقفیٰ و مسجع کی چاشنی سے نظم کا لطف آجاتا ہے۔ ویسے بھی جس قوم نے اپنے عہد طفلی میں قرآن پاک کی خوش آہنگ تلاوت کی تھی کس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ قوم ارتقا کر کے اس خاص طرز ادا میں کوئی دلچسپی نہ لے۔ لہٰذا رنگینی اور رنگین بیانی مسلمان قوم کا ایک مابہ الا متیاز ہے۔ ''داستان امیر حمزہ'' میں پرتکلف اسلوب کے پہلو بہ پہلو سادہ اور صاف اسلوب بھی موجزن ہے۔ اس ضمن میں گیان چند جین کا یہ قول ملاحظہ کریں:

> ''داستان امیر حمزہ میں دو طرز تحریر ہیں۔ ایک مرصع اور رنگین اور دوسرا سادہ عاری۔ داستان گو قدیم بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے انھیں فسانہ عجائب کا طرز ضرور مرغوب ہوگا لیکن اتنا ضخیم قصہ کسی مصنوعی اسلوب میں نہیں لکھا جاسکتا۔ مجبوراً صاف اور شستہ انداز آجاتا ہے۔''[۱۷]

''داستانِ امیر حمزہ'' کے جواب میں ''بوستانِ خیال'' لکھی گئی، اسے بھی مختلف مولفین نے رقم کیا۔ فارسی میں یہ داستان سید محمد تقی خیال کی تصنیف ہے۔ اُردو میں سب سے پہلے عالم نے ترجمہ کیا اور بعد ازاں رام پور، دہلی اور لکھنو میں اس کے متعدد تراجم ہوئے۔ لکھنو اور دہلی میں ہونے والے تراجم کو زیادہ مقبولیت ملی۔ لکھنو میں نول کشور پریس کے لیے مرزا محمد عسکری، پیارے مرزا آغا، جوہندی اور آغا محمد عسکری نے ترجمہ کیا جبکہ دہلی میں خواجہ امان اللہ نے اسے ترجمہ کیا۔ ''داستانِ امیر حمزہ'' کی طرح مختلف اور متعدد مترجمین کے ہاتھوں ''بوستانِ خیال'' کا اسلوب متنوع تجربات سے گزرا ہے۔ اس اسلوب کو شعوری طور پر لکھنوی طرزِ نگارش پر رنگین بنانے کی سعی کی گئی۔

''داستانِ امیر حمزہ'' اور ''بوستانِ خیال'' کی مانند ''الف لیلہ'' کے بھی اُردو میں تراجم ہوئے۔ ''الف لیلہ'' مشرق و

مغرب میں یکساں مقبول ہے، یہ داستان انسانی تخیل اور دشمن جاں راتوں کے ہنگاموں کی تمثیل ہے۔ اس میں ایک طرف تو ایران سے چین تک کی تہذیب ہے تو دوسری طرف یونان اور مغرب کا تمدن موجود ہے نیز اس کی کہانیوں میں اوڈیسی، بدھ مت کی جاتک کہانیوں اور اموی و عباسی عہد کی خصوصیات بھی موجود ہیں۔ ''الف لیلہ'' کے مترجمین میں رتن ناتھ سرشار کا ترجمہ تخلیقی بھی ہے اور اس کا اسلوب بھی عوام و خواص دونوں میں یکساں مقبول تھا۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ ''سرشار رنگینی اور سادگی کو اس طرح شیر و شکر کرتے ہیں کہ شعر و نثر کے ڈانڈے مل جائیں، بات میں روزمرہ اور برجستہ اشعار کو اس طرح سموتے ہیں کہ سننے والا پھڑک جائے۔''[۱۸] لکھنوی داستانی اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے سرشار نے رنگین بیانی کے لیے اشعار بکثرت استعمال کیے ہیں لیکن طرز ادا سادہ اور سلیس ہے جس میں محاوروں کی بھرمار نہیں ہے۔ ''الف لیلہ'' اور ''داستانِ امیر حمزہ'' کی طرح کئی داستانیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ یورپی مصنفین بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ داستانوں کی مقبولیت کا راز ان کے دلچسپ اور منفرد اسالیب بیان میں تھا جس کو داستان گوؤں نے قصوں کی صورت میں تحیر و تجسّس کی فضا میں نمو پاتے ہوئے پروان چڑھایا۔

الغرض نثری داستانی ادب کا دور اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں اپنے عروج کے دو سو سال مکمل کرتا نظر آتا ہے۔ غرض یہ کہ اُردو کی نثری داستانوں میں ملا وجہی کی ''سب رس'' سے جس اسلوب کی ابتدا ہوئی وہ تبدیلیوں سے گزرتا ہوا تحسینؔ کی ''نو طرز مرصع'' تک پہنچا۔ ''نو طرز مرصع'' کی طرح شمالی ہند کی دیگر داستانیں ''قصہ مہر افروز و دلبر''، ''قصہ ملک محمد و گیتی افروز'' اور ''جذبِ عشق'' پر فارسی کا مرصع اسلوب غالب رہا، یہ داستانی اسلوب تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ صنائع و بدائع اور رعایت لفظی کے استعمال سے اپنے عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف اٹھارھویں صدی میں ہی شاہ عالم ثانی نے ''عجائب القصص'' میں سادہ، معیاری، رواں اور شستہ اسلوب کو رواج دیا۔ اس اسلوب پر نہ صرف جدید اُردو نثر کی بنیاد رکھی گئی بلکہ سادگی کے حوالے سے یہ اسلوب سرسید سمیت مختلف دبستانوں کا سنگ میل بنتا ہے۔ مغلیہ عہد کے جلال و جمال نے اس داستان کو ''کتاب التہذیب و آداب'' کی صورت عطا کی ہے، انھی رجحانات نے ''طلسم ہوش ربا'' اور عبدالحلیم شرر کے ناولوں میں فروغ پایا۔ اسی دوران مہر چند کھتری مہرؔ نے ''نو آئین ہندی'' کے اسلوب کو انیسویں اور بیسویں صدی کے مذاق کے مطابق ڈھالا۔ مہرؔ کے جملوں کی ساخت اور لہجہ بھی جدید طرز تحریر سے مطابقت رکھتا ہے اور فی زمانہ متروکات سے بھی اجتناب برتا گیا ہے۔ داستانی طرز نگارش میں عربیت کے فسوں کو توڑنے کا سہرا جو میر امنؔ کے سر باندھا جاتا ہے، وہ دراصل مہرؔ کی داستان ''نو آئین ہندی'' کا خاصہ ہے۔

داستانی اسلوب کی یہ رنگا رنگی اور گہما گہمی اٹھارھویں صدی کی طرح انیسویں صدی میں بھی موجود رہی۔ انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج میں ''باغ و بہار'' سادہ وسلیس اور واقعیت وسلاست کی عظمت ثابت ہوئی تو بیرون فورٹ ولیم کالج ''فسانۂ عجائب'' پرتکلف اسلوب کی نمائندہ داستان لکھی گئی۔ ویسے تو فورٹ ولیم کالج کے اندر بھی سادگی و پر کاری کے برعکس عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کا وہ دھارا بھی موجود ہے جو ''نوطرز مرصع'' سے متاثر رہا۔ داستانی اسالیب میں دو رجحانات بیک وقت رواں ہیں، ایک سادگی وسلاست اور واقعاتی کیفیتوں کا غماز ہے تو دوسرا رنگینی، تکلف و تصنع، قافیہ پیمائی اور محاوروں کی سجاوٹ سے مزین ہے۔ ان دونوں رجحانات کی دل کش آمیزش سے داستانی ادب میں ادبیت پیدا ہوئی ہے۔

داستانی دُنیا کی مانند داستانی اسلوب بھی تخیلاتی وطلسماتی، وسیع وعظیم اور بڑا رنگین و دل کش ہے جس میں ادبیت وعلمیت کے بیش بہا موتی موجود ہیں۔ ان قصوں میں داستان گوؤں کا تخیل شعوری ولا شعوری ہر دو سطحوں پر اسالیب بیان کی حسین اور حیران کن گلکاریاں کھلاتا ہے اور یہ طلسمات وسحر سے منقش ومزین واقعات، طرز بیان کی بلند پروازیوں اور تصور کی ندرت آفرینیوں سے سجے ہیں۔ داستانی ادب کے اس گنگا جمنی اسلوب نے اپنے دامن میں دکنی، ہندی، سنسکرت، برج بھاشا، عربی اور فارسی اسالیب کی شیرینی، دلکشی، برجستگی اور دل آویزی سمیٹتے ہوئے اُردو نثر کو نہ صرف واضح منزل دکھائی ہے بلکہ قدیم وجدید اسلوب کا وہ امتزاج بھی بخشا جو آپ اپنی مثال ہے، بعد ازاں اسی کے بطن سے جدید نثری اسالیب پھوٹے۔ داستانی ادب کے اسالیب میں تنوع، رنگا رنگی اور بوقلمونی دیکھتے ہوئے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصر حاضر کی اُردو نثر کے تہلکے وتموج اور ارتقائی مراحل کا ہر سرا داستانوں سے ہی جڑا ہوا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ وجہیؔ، اسداللہ، سب رس، مرتب : شمیم انھونوی، لکھنو : مکتبہ کلیاں، ۱۹۶۲ء، ص ۱۲ :

۲۔ سید عبداللہ، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور : مکتبہ خیابان ادب، اشاعت دوم، ۱۹۷۷ء، ص ۳۱ :

۳۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو (جلد دوم۔حصّہ دوم)، دہلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۰۶ :

۴۔ شہناز انجم، ادبی نثر کا ارتقاء (شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک)، لاہور : پروگیسو بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۳۳۷ :

۵۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو (جلد دوم۔حصّہ دوم)، ص ۱۱۲۰ :

۶۔ حیدریؔ، حیدر بخش، آرائش محفل، مرتب : سید سبط حسین، لاہور : مجلس ترقی ادب، طباعت دوم، ۲۰۰۹ء، ص ۸ :

۷۔ مجید بیدار، نثری بیانیہ، نئی دہلی : تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۷ :
۸۔ میر امن، باغ و بہار، مرتب : رشید حسن خان، لاہور : مجلس ترقی ادب، طبع اوّل، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۰ :
۹۔ سہیل بخاری، اُردو داستان۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، اسلام آباد : مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۱ :
۱۰۔ گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، کراچی : انجمن ترقی اُردو پاکستان، اشاعت سوم، ۲۰۱۴ء، ص ۲۸۸ :
۱۱۔ احتشام حسین، اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ، نئی دہلی : قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، چوتھا ایڈیشن، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۳ :
۱۲۔ مہجور، محمد بخش، نورتن، لاہور : مجلس ترقی ادب، طبع اوّل، ۱۹۶۲ء، ص ۱۶۸ :
۱۳۔ آرزو چودھری، داستان کی داستان، لاہور : عظیم اکیڈمی، طبع اوّل، ۱۹۸۸ء، ص ۴۳۴ :
۱۴۔ کلیم الدین احمد، اُردو زبان اور فن داستان گوئی، لاہور : عالمین پبلی کیشنز، اشاعت اوّل، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۷ :
۱۵۔ تبسم کاشمیری، اُردو زبان کی تاریخ (ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک)، لاہور : سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۵۳۸ :
۱۶۔ رفیق حسین، سید، افسانوی اصول اور فسانہ عجائب، الہ آباد : رام دیال اگروالا کبڑہ، اشاعت اوّل، ۱۹۷۵ء، ص ۱۹۰ :
۱۷۔ گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، ص ۲۶ ۷ :
۱۸۔ وقار عظیم، سید، ہماری داستانیں، لاہور : الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۴۵۲ :

***

کلامِ مظہر الدین مظہر : فکری و فنی مباحث

☆ڈاکٹر خالد محمود☆☆ڈاکٹر محمد اعجاز تبسم

Kalam-i Mazharuddin Mazhar: Intellectual and Technical Discussions

Dr. Khalid Mahmood/ Dr. Mohammad Ijaz Tabasum

The true expression of feelings and emotions in Kalam Mazharuddin Mazhar is in fact the best proof of his mature intellectual and artistic consciousness, standard tone and unique way of expression. In his word all aspects of natural life and aspects of human way of life are clearly present. He has impressed it with all his artistic accessories, eloquent words and phonetic beauty. He has presented the beautiful hair of the beloved and the radiant life of the beloved's face and the sacrifices made for the sake of truth and victory by wrapping them in the natural pains of love. He appears in his word to inhabit a new world by adopting the earthly elements of life and the universal way of thinking. In Kalam Mazhar-ud-Din Mazhar, simplicity and smoothness, ingenuity and innovation, concealment of ideas and moods, element of innovation in

traditional metaphors, aesthetic harmony of poetic allusions and gestures and symbols establish their own semantic system. In his coated poems, he creates an effective inner feeling with the help of religious culture, social color and historical consciousness of Islamic civilization. He hints at the Yazidis of the time moving towards a straight line with a curse. This article will cover the above topics.

فکری وفنی محاسن، شعری تلازمات، صنائع و بدائع، تہذیبی وسماجی رنگ، علائم و رموز، تہذیبی اقدار، ہیئتی تنوع، لبِ جبرئیلؑ، جلال و جمال، ارضی عناصر، حسیاتی شعور، رعایت لفظی، حسرت جلوۂ دیدار، خال و رُخسار، تہذیبی رویے، قرآن و حدیث کے ماخذ، مفرس ومعرب زبان، صنعتِ تلمیح، صنعتِ ترصیع، صنعتِ تجنیس، تکرارِ لفظی، سہل ممتنع، محاکات نگاری، لف ونشر، صنعتِ سوال وجواب، صنعتِ حسنِ تعلیل، صنعتِ تضاد۔

شاعر کے لیے تخیل کی بلندی اور فکری کینوس کی وسعت اس کی فنی پختگی کا ثبوت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فن شعر کی باریکیوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ دل میں اترنے والی شاعری وہی ہوتی ہے جس میں تخیل، بلندیِ فکر اور فن کی پختگی بھی موجود ہو۔ اگر شاعر کے ہاں کسی ایک جز کی بھی کمی ہوگی تو اس کی شاعری معیاری اور اعلیٰ شاعری قرار نہیں دی جاسکے گی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ شاعری فکر وفنی دونوں سطح پر بلند ہو۔ بہر کیف خیال اور زبان و بیان منفرد ہوں گے تو شاعری میں جان ہوگی ورنہ وہ صرف لفظوں کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ شاعری کے لیے حسنِ اظہار بنیادی شرط ہے۔ کلام میں حسنِ اظہار اور تاثیر مل کر وہ خوبی اور صلاحیت پیدا کرتے ہیں جس کی بنیاد پر کلام دل پذیری حاصل کرتا ہے۔ شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ شعر اس انداز سے کہے کہ لوگ اسے اپنے دل کی آواز اور اپنے احساسات و جذبات کی سچی ترجمانی خیال کریں۔ ایسا صرف اور صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں زبان و بیان اور فن کی سطح پر اظہار کی خوب صورتی موجود ہو۔ رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے:

"ہیئت، موضوع، مواد سب محتاج ہیں ابلاغ کے اور ابلاغ محنت ہے حسنِ اظہار کا، جو منحصر ہے خلوص اور سلیقہ پر۔ کسی بات کا دل میں پیدا ہونا اتنا اہم نہیں جتنا اس کا دوسرے کے دل میں اتارنا اور دل میں بات اتاری جاتی

ہے حسنِ اظہار سے۔"(۱)

مظہر الدین مظہر کے کلام کا مطالعہ اسی حقیقت کو ہمارے سامنے لاتا ہے کہ ان کا نعتیہ کلام نہ صرف فکری وفنی حوالے سے ترفع کا حامل ہے بلکہ اس کے اندر جملہ فنی لوازمات بھی پوری طرح موجود ہیں۔ان کے کلام میں مختلف شاعرانہ ہیئتوں کا تنوع اور مختلف صنعتوں کی خوب صورت مثالیں موجود ہیں۔کلامِ مظہر میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی شعری ہیئت غزل ہے۔ان کی بہت سی نعتیں قافیہ وردیف کے صوتی حسن سے بھی مالا مال ہیں۔جس سے ان کے کلام میں ترنم کی کیفیت خود بخود پیدا ہوگئی ہے۔بہر کیف ان کے ہاں صنائع و بدائع کا استعمال بھی سلیقے سے کیا گیا ہے جو ان کے کلام کی تاثیر میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

کلامِ مظہر الدین مظہر میں احساسات و جذبات کی سچی ترجمانی دراصل ان کے پختہ فکری وفنی شعور، معیاری لب و لہجے اور منفرد طرزِ ادا کا بہترین ثبوت ہے۔انھوں نے اپنے جملہ فنی لوازمات، برجستہ لفظیات اور صوتی حسن سے اسے پُر تاثیر بنایا ہے۔ان کے ہاں فطری زندگی کی تمام روشیں اور انسانی طرزِ حیات کے کئی رُخ اپنی واضح ترین صورت میں موجود ہیں۔ وہ اپنے کلام میں زندگی کے ارضی عناصر اور آفاقی طرزِ فکر کو اپنا کر اک نیا جہاں آباد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے جمالِ زلف و رُخِ یار کی ضیافشاں زندگی اور حق و نصرت کی خاطر دی گئی قربانیوں کو عشق کے فطری سوز و گداز میں ملفوف کر کے پیش کیا ہے۔

وہ اپنے ملمع اشعار میں اسلامی تہذیب کے مذہبی، تمدنی، سماجی رنگ اور تاریخی شعور کی مدد سے داخلی احساس پیدا کرتے ہیں۔کلامِ مظہر الدین مظہر میں سادگی و سلاست، صنائع و بدائع، رعنائیِ خیال اور جذب و کیف کی صورت، روایتی استعاروں میں جدت طرازی کا عنصر اور شعری تلازمات وعلائم و رموز کا جمالیاتی آہنگ اپنا ایک معنیاتی نظام قائم کرتا ہے۔عہدِ حاضر میں تہذیبی رویوں اور انسانی مزاجوں کے تغیر و تبدل سے حق و صداقت کا معیار گرتا جا رہا ہے۔مظہر الدین مظہر عصرِ رواں کے یزیدوں کو طعن و تشنیع کے ساتھ صراطِ مستقیم کی جانب گامزن ہونے کا عندیہ دیتے ہیں۔دراصل یہ خاک پرور زندگی کی اعلیٰ اقدار، تہذیبی وسماجی رعنائی اور معرفتِ حق کا جمالیاتی اظہار، تہذیبی اقدار کا کھوج لگانا، ان کے کلام کا خاص وصف ہے۔

کلامِ مظہر میں ہیئتی تنوع

مظہر الدین مظہر رسول پاک ﷺ کی محبت سے سرشار ہیں۔ وہ اس مشتِ خاک کی صداقت وصلاحیت

کے قائل ہیں جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔آپ ﷺ باعثِ تخلیق کائنات ہیں، مہ ومہر نے بھی آپ ﷺ کی نبوت کو تسلیم کیا۔آپ ﷺ کے جلوۂ حسن کے تذکرے چار دانگ عالم میں پھیلے،زندگی کی صداقتوں اور تہذیبی رویوں کی اصل کھوج آپ ﷺ کی دہلیز پر ملتی ہے۔کئی شاہ وگدا آپ ﷺ کے آستاں پر جھکتے ہیں۔فرشتۂ رحمت آپ ﷺ کے گھر کا دربان ہے۔

جہاں بھی تذکرے انوارِ مصطفیٰ ﷺ کے چلے　　وہیں نجوم و مہ و مہر منہ چھپا کے چلے
اس آستاں پہ بشر کیوں نہ سجدہ ریز آئے؟　　جہاں فرشتۂ رحمت بھی سر جھکا کے چلے (۲)

مظہرالدین مظہر کے کلام میں مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی نعتیں ان کے پرخلوص لب ولہجہ کی غماز ہیں۔ان کے اشعار میں کیف ومستی کا سماں،عاشق کی محبوبِ الٰہی کی خاطر اشکوں کی روانی اور جذبات واحساسات سے بھری خودی وصداقت کا منظر بہت معنی خیز ہے۔

کیا مستی و کیف کا سماں تھا　　جب میں رہِ طیبہ میں رواں تھا
آنکھوں سے تھے پیہم اشک جاری　　جذبات پہ بے خودی تھی طاری (۳)

ان کے نعتیہ کلام میں مخمس کی ہیئت میں ایک سلام موجود ہے۔ فارس کے مشہور شاعر قدسیؒ کی نعت پر تضمین بھی مخمس ہی کی ہیئت میں ملتی ہے۔وہ رسول کونین ﷺ کے حُسن وجمال،معجزات وخصائص اور لطف وعنایت کا تذکرہ نہایت جذب وکیف کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ کائنات اور اس میں پھیلے فطری نظارے آپ ﷺ کی ذات و بابرکات کا عکس جمیل ہیں،لبِ جبرئیل پر شام وسحر ثنائے مصطفیٰ ﷺ،قدسیوں اور خاک پرور زندگی کی اعلیٰ اقدار میں آپ ﷺ کی تہذیبی وسماجی رعنائی اسے اور بھی معرفتِ حق کا جمالیاتی اظہار عطا کرتی ہے۔

اے کے تیرا جمال ہے رونق محفلِ وجود　　اے کہ تیری نمود ہے جلوہ طرازِ ہست و بود
یادِ تو داد لذتے ذکرِ تو شوقِ من فروز　　تجھ پر درود اور سلام تجھ پر سلام اور درود
صل علی نبینا صل علیٰ محمدٍ ﷺ

آئینہ جمال ہے صورتِ حق نما تری　　پھیلی ہے کائنات میں چاروں طرف ضیا تری
ہے لبِ جبرئیلؑ پر شام و سحر ثنا تری　　غازۂ روئے قدسیاں تابش خاک پا تری

صل علی نبینا صل علیٰ محمدٍ ﷺ (۴)

کلامِ مظہر الدین مظہر میں رباعیات کی صورت میں بھی نعتیہ کلام کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے بڑی روانی اور فنی حسن کے ساتھ رباعیات کہہ کر فنِ شعر پر اپنی گرفت کا ثبوت دیا ہے۔وہ آپ ﷺ کی شانِ دل ربائی کے قائل ہیں جس کی حق نمائی سے دنیا مینارۂ نور بنی،عصرِ حاضر میں بدلتے ہوئے تہذیبی رویوں اور انسانی مزاجوں سے حق وصداقت کا معیار گرتا جارہا ہے۔مظہر الدین مظہر اُمتِ مسلمہ کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر شاہِ کربلا کی آمد کے متمنی نظر آتے ہیں جنھوں نے دین اسلام کی فتح ونصرت کی خاطر اپنے خاندان کو ذبح کرانے سے دریغ نہیں کیا۔

وہ شان و ادائے دلربائی تیری　　عالم کو ہے یاد حق نمائی تیری
پھر گھیرا ہے وقت کے یزیدوں نے ہمیں　　شاہنشہِ کربلا! دہائی تیری(۵)

مفرس ومعرب زبان

مظہر الدین مظہر کو عربی اور فارسی زبان پر اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔انھوں نے اپنے کلام میں فارسی اور عربی الفاظ کو نہایت خوب صورتی اور فنی مہارت سے سمویا ہے جس سے ان کے کلام میں کہیں بھی بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ یہ الفاظ ان کے اشعار کی روانی اور فنی پختگی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔لہٰذا ان کے کلام میں زبان آسان اور رواں دواں ہے،جس سے قاری کو کہیں بھی گرانی کا احساس نہیں ہوتا مثلاً رحمتِ یزداں،رسولِ عربی ﷺ،فخرِ رسولاں، تمنائے دل،"برمن خستہ نگاہے کہ نگاہِ نویس است"،سوختہ ساماں،شانِ شاہاں اور سید ذی شاں جیسی تراکیب سے ان کے کلام میں معنوی حُسن پیدا ہوا ہے۔اس سے کہیں بھی طرزِ فکر وادائے شعر متاثر نہیں ہوتا۔

رحمتِ مددی، رحمتِ یزداں مددی　　ای رسول ﷺ عربی! فخرِ رسولاں مددی
برمنِ خستہ نگاھی کہ نگاہ نویس است　　ای تمنائ دلِ سوختہ ساماں مددی
ما فقیران ز تو امیدِ کرم ھا داریم　　شانِ شاھاں مددے، سید ذی شاں مددی(۶)

مذکورہ اشعار میں مظہر الدین مظہر کے ہاں عشقِ رسول ﷺ کی تڑپ،سوز وگداز اور عشق ومستی کی کیفیت صاف نظر آرہی ہے۔وہ رسول کونین ﷺ سے پاکیزہ محبت کے جذبے کو لطف وسرور عطا کرتے ہیں۔ان کا تاریخی ومذہبی شعور تمام شعری مجموعوں"شمشیر وسناں"،"حرب وضرب"،"نور ونار"،"تجلیات"،"میزاب"،"جلوہ گاہ" اور"بابِ جبرئیل" میں اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا دکھائی دیتا ہے۔

قرآن وحدیث کے مآخذ

کلامِ مظہر الدین مظہر میں عربی الفاظ کا استعمال بھی نہایت مہارت اور خوب صورتی کے ساتھ ہوا ہے۔ان کے کلام میں قرآنی الفاظ، آیاتِ مقدسہ کے اقتباس اور احادیثِ رسول اکرم ﷺ کے حوالے کسی نہ کسی شکل میں اس کے معنوی وصوری حُسن میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ مقدس ومتبرک الفاظ ان کے کلام میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً بحمد للہ، الفقر وفخری، دامانِ ربیع الاول اور لا الہ الا اللہ نے ان کے فکری وتہذیبی شعور کو ایک خاص رعنائی و دلکشی بخشی ہے۔وہ اپنی خوئے درویشانہ اور عشقِ رسول ﷺ کی مدد سے عصر حاضر میں بدلتے ہوئے تہذیبی مزاج کو ایک نیا رنگ نیا آہنگ عطا کرتے ہیں۔

سبق ہے یاد مجھ کو آج بھی "الفقر و فخری" کا! بحمد للہ! ہے میری خوئے درویشانہ برسوں سے(۷)

بزمِ کونین ہے یہ، مصر کا بازار نہیں آپ ہیں یوسفِ کنعانِ ربیع الاول(۸)

قلندروں کی اذاں لا الہ الا اللہ سرودِ زندہ دلاں لا الہ الا اللہ(۹)

نظر اٹھا کر جمودِ حیات بھی ٹوٹے پکار زمزمہ خواں! لا الہ الا اللہ(۱۰)

کلامِ مظہر الدین مظہر میں عامیانہ پن نہیں ملتا۔ان کی سخن گوئی میں ایک طرح سے روحانی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔وہ کیفیت صہبا، مستی وسرشاری، اثر آفرینی، جذب وسلوک اور معرفت جیسی صفات سے اپنے کلام کو بصیرت افروز بناتے ہیں۔ان درج بالا اشعار میں اک حساس طبع شاعر کی بے دست و پا حیات اور عجز وانکساری کا رنگ صاف دکھائی دے رہا ہے۔مظہر الدین مظہر اپنی خوئے درویشانہ سے اک پُر تاثیر اور درد وسوز سے بھری زندگی کے خواہاں دکھائی دیتے ہیں۔ان کے کلام پر اقبال کا رنگ نمایاں نظر آرہا ہے مثلاً "قلندروں کی اذاں لا الہ الا اللہ"

تراکیب کا برمحل استعمال

کلام مظہر میں ہمیں تراکیب کا بھی عمدہ اور برمحل استعمال نظر آتا ہے۔ ان کی وضع کردہ تراکیب غایتِ نوازش، سرخیٔ روئے حیات، سمانِ شہیدِ کربلا، وجدانِ شہید کربلا، تاب وتب سینۂ بلال، شکوہِ خروی، سلاطین روزگار، لحن عجم، منصبِ غلامیٔ فخرِ زمان، دمسازِ غریباں، مشعلِ صبحِ اولیں، جلال و جمال، صوتی تاثر، پُر تاثیر معنویت اور فنکارانہ مہارت کا بہترین ثبوت ہیں۔ یہ خوب صورت اور دل آویز تراکیب قاری کے قلب و ذہن پر اپنا بھرپور تاریخی وتہذیبی، سماجی، ادبی اور معنیاتی تاثر قائم کرتی ہیں۔علاوہ ازیں حسرت جلوۂ دیدار، رُخ پُرنور، کاکل پیچاں اور فیضِ درسِ کاران کی مذہبی

وتہذیبی وارفتگی کا ثبوت ہیں۔ان کے ہاں یہ تراکیب احساسِ ذات وکائنات کی آرزو لے کر جلوہ گر نظر آتی ہے۔

رو برو رہتے ہیں انوارِ مدینہ مظہرؔ حسرتِ جلوۂ دیدار بہت کافی ہے(۱۱)
آرزو ہے دمِ آخر مری نظروں میں رہے رخِ پر نور ترا، کاکل پیچاں تیرا (۱۲)
مست، ہر طالبِ دیدار نظر آتا ہے یوں بھی فیضِ درِ سرکارﷺ نظر آتا ہے(۱۳)

کلام مظہر الدین مظہر میں یہ خوبصورت طرزِ ادا،ان کے باطنی وظاہری احساسِ جمال کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔تراکیب سازی کا یہ صحت مند رجحان ان کے کلام کی تاثیر کو بڑھانے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔وہ رسول پاکﷺ سے اپنی عاجزانہ محبت کو والہانہ جذب وشوق سے پیش کرتے ہیں۔

تشبیہات

مظہر الدین مظہر نے اپنے کلام میں خوب صورت تشبیہات کو فنی چابک دستی سے برتا ہے جس سے ان کے کلام کی تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔اُردو غزل گو شعرا نے محبوب حجازی کے حُسن و جمال، ناز وادائے محبوب، نزاکتِ جسم و جاں، لبِ لعلیں، اعضائے محبوب، اس کے دلفریب نین، چاہِ ذقن، صراحی دار گردن اور خال ورخسار کو نزاکتِ خیال سے بیان کیا ہے۔یہ مذہبی تاثیر سے بھرپور تشبیہاتی رنگ، تہذیب اسلام کے جلال و جمال اور جمالیاتی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے مگر نعتیہ شاعری میں اس طرح کے شعری تلازمات اور رنگِ سخن کو اپنانا نہایت مشکل ہے۔مظہر الدین مظہر نے بڑی جگر کاوی اور جمالیاتی رعنائی سے تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔

ہر ایک چہرہ شہرِ نبیﷺ میں تھا لالہ رنگ جیسے گل گلاب ہو کوئی کھلا ہوا(۱۴)
ان کے جلووں سے ہوئی جاتی ہیں آنکھیں خیرہ مثلِ خورشید ہیں ذرات بیابانِ فریدؒ(۱۵)
اب رنگ ہے، کچھ اور مدینے کے گدا کا گویا کوئی سلطان مدینے کو چلا ہے(۱۶)

ان مذکورہ تشبیہات میں فطرت کی عکاسی اور محبت کا حقیقی رنگ ملتا ہے۔"ہر ایک چہرہ شہرِ نبیﷺ میں تھا لالہ رنگ"، گلاب کا کھلنا،"جلووں سے آنکھیں خیرہ ہونا"،"ذرات کا مثلِ خورشید ہونا" اس میں ذرا برابر بھی مصنوعی پن نظر نہیں آتا۔مظہر الدین مظہر نے نہایت سادگی کے ساتھ محبوب الٰہیﷺ سے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔

استعارے

مظہر الدین مظہر نے اپنی نعتیہ شاعری میں استعارات کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔ان کا

استعاراتی نظام بڑا معنی خیز ہے۔ وہ قدیم روایتی استعاروں کے استعمال سے نئی معنویت اور نیا طرزِ فکر پیدا کر دیتے ہیں۔ کلاسیکی اُردو شاعری میں "چاند" مہر اور قمر زیادہ تر آئے ہیں۔ "جس میں عرب کا مہر مبیں جلوہ گر ہوا"، "اے مرے چاند پھیلا ادھر چاندنی" اور "جب تصور میں مدینے کا قمر نظر آیا" ان مصرعوں میں سادگی و سلاست اور رعنائی خیال کی فراوانی ہے۔ انھوں نے بڑی وارفتگی اور جذب و کیف کی صورت میں محبوبِ الٰہی سے اپنی الفت کا اظہار کیا ہے۔

میری دنیا بھی نور علیٰ نور ہو — اے مرے چاند، پھیلا اِدھر چاندنی (۱۷)
جس میں عرب کا مہر مبین جلوہ گر ہوا — صدیوں کے بعد بھی وہ مہینہ نظر میں ہے (۱۸)
چاندنی پھیل گئی ہے مرے روح و دل میں — جب تصور میں مدینے کا قمر نظر آیا ہے (۱۹)

مظہر الدین مظہر کے استعارے اُردو شاعری کے روایتی رنگ میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک فطری ذوق و شوق اور احساسِ تفاخر ملتا ہے۔ وہ محبوبِ الٰہی ﷺ کے لیے جن استعاروں کا استعمال کرتے ہیں ان میں تقدس، لحاظ، احترام اور مقام و مرتبہ کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔

صنعتِ تلمیح

مظہر الدین مظہر کے کلام میں صنعتِ تلمیح کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔ یہ تلمیحات قرآن و حدیث، سیرتِ رسول اکرم ﷺ، صحابہ کرامؓ اور معروف مذہبی اساطیری کرداروں سے متعلقہ ہیں۔ مثلاً لبِ جاں بخش مسیحا، یدِ بیضائے کلیم، حسنِ یوسفؑ، طور و کلیم، کوہِ طور، غارِ حرا، غارِ ثور، ذبحِ اسماعیلؑ، خلیلؑ و اسماعیلؑ، بدر و حنین، احد، معراجِ مصطفیٰ ﷺ، بیابانِ فرید، حجرِ اسود، چاہِ کنعاں، ماہِ کنعاں، گریۂ یعقوبؑ، صبرِ ایوبؑ، وادیِ ایمن، نخلِ طور اور یسوع و مسیح وغیرہ۔ یہ تلمیحات ان کی مسلم تہذیب و ثقافت سے فطری وابستگی کا بہترین ثبوت ہیں۔ ان ملمع اشعار میں اسلامی تہذیب کا مذہبی رنگ، تاریخی و سماجی شعور و اقعاتی تاثر اور داخلی احساس بھرپور انداز میں ملتا ہے۔

مرے خواجہ ﷺ کی عنایت کے مظاہر ہیں تمام — لب جاں بخش مسیحاؑ، ید بیضائے کلیمؑ (۲۰)
حسن یوسفؑ کے بھی چرچے تھے جہاں میں لیکن — رنگ پر آئی ہے بزم ترے نام کے بعد (۲۱)
روداد کوہِ طور کی مشہور ہوگئی — غارِ حرا کے سینے کا افسانہ راز ہے (۲۲)

مظہر الدین مظہر منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ وہ اسلامی تاریخ و تہذیب سے ماخوذ مذہبی کرداروں کے ذریعے افسردہ دلوں اور مرجھائے چہروں میں شادمانی بھر دیتے ہیں۔ ان کا یہ عاجزانہ احساسِ تفاخر اور دل و روح کو

سرشار کر دینے والی کیفیت قاری کو اسلامی تاریخ کے عہدِ ماضی میں لا کھڑا کرتی ہے۔

صنعتِ حسن تعلیل

شاعر اپنے کلام میں حسن اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے حسن تعلیل کا استعمال کرتے ہیں۔ حسن تعلیل کے لغوی معنی علت یا توجیہ پیش کرنے کے ہیں۔ نظم/نثر میں کوئی ایسی وجہ بیان کی جاتی ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی لیکن شاعر اس خوب صورتی کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ سید عابد علی عابد حسن تعلیل کے بارے لکھتے ہیں:

"کسی امر کے لیے ایسی وجہ بیان کی جائے جو درحقیقت اس کی وجہ نہ ہو۔ حقیقی وجہ کچھ اور ہو یا وجہ معلوم ہی نہ ہو۔" (۲۳)

وہ زندگی کے روحانی جذبوں کے امین اور فطری چاہتوں کے مرصع ساز شاعر ہیں۔ انھوں نے جمالِ زلف و رُخِ یار کی ضیا فشاں زندگی اور حق و نصرت کی خاطر دی گئی قربانیوں کو عشق کے فطری سوز و گداز میں ملفوف کر کے پیش کیا ہے۔ دراصل گلشن میں رنگینیاں، مدینہ طیبہ کے نظاروں میں سماں اور چہرۂ آفتاب میں آب و تاب کا رنگ ان کے کلام کا خاص وصف ہے۔ وہ محبوبِ حقیقی سے اپنا تعلق خاطر جوڑتے نظر آتے ہیں۔ کلام مظہر الدین مظہر سے صنعت حسن تعلیل کی چند مثالیں دیکھیے:

حریفِ طور و ایمن ہے ہر اک ذرہ مدینے کا — ادھر دیکھیں فروغِ طور سینا دیکھنے والے (۲۴)

طور و ایمن پہ جو موسیٰؑ کو نظر آیا تھا — تھا وہ ایک جلوہ تابندہ رخسار رسول ﷺ (۲۵)

گلشن کائنات کو تجھ سے ملا ہے رنگ و نور — چہرہ آفتاب کو تجھ سے ملی ہے آب و تاب (۲۶)

صنعتِ مراعاۃ النظیر

مراعاۃ النظیر سے مراد یہ ہے کلام میں کئی ایسی چیزیں مذکور ہوں جو باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہوں، لیکن یہ مناسبت بطور تضاد نہ ہو۔ یہ متناسب چیزیں کبھی دو ہوتی ہیں کبھی دو سے زیادہ۔

دیکھیے صنعت مراعاۃ النظیر مظہر الدین مظہر کی شاعری کو مزید خوب صورت بنا رہی ہے:

صحنِ گلشن میں ہے ان کی خوشبو — باغِ عالم میں ہے نکہت ان کی (۲۷)

بہشت و کوثر جامِ طہور کی ضامن — صدائے آلِ محمد ﷺ، نوائے آلِ رسول (۲۸)

گلزار بھی، دشت بھی، جبل بھی — کانٹے بھی، پھول بھی، کنول بھی (۲۹)

مظہر الدین مظہر نے ان معنی خیز تراکیب، خوب صورت بندشوں اور مشاہدے کے درد و کرب سے اپنے

کلام کو تازگی عطا کر دی ہے۔ وہ اپنے جمالیاتی شعور اور فکر و فن کی ہم آہنگی سے اسے مزید پُر تاثیر بنا دیتے ہیں۔

صنعت تضاد

دو ایسے الفاظ کلام میں استعمال کیے جائیں جو معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں، یعنی صنعتِ تضاد اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں معانی متضاد کو جمع کر دیا جائے۔ مظہر الدین مظہر کے کلام میں اس صنعت کے حامل اشعار کی تعداد کافی ہے۔ ان کے ہاں زندگی کی تمام روشیں اور طرزِ حیات کے کئی رُخ ملتے ہیں۔ "یہ شب و روز اور شام وسحر" اور قدرت کے حسین منظر زندگی کے وجدانی حُسن کا بہترین اظہار ہیں۔ وہ اپنے کلام میں زندگی کے ارضی عناصر اور آفاقی طرزِ فکر کو اپنا کر ایک نیا جہان آباد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ شب و روز اور شام و سحر   تیری قدرت کے حسین منظر(۳۰)
جلوہ صبحِ ازل! تابانی شامِ ابد   نورِ چشمِ اولیں و نورِ چشمِ آخریں (۳۱)
ہے تیرے غلاموں کے لیے باغِ بہشت   ہے تیرے حریفوں کے لیے نارِ جہیم(۳۲)

ان مذکورہ اشعار میں مظہر الدین مظہر فطری زندگی کی رعنائیوں اور اس کے تہذیبی رویوں کو پروان چڑھاتے نظر آتے ہیں۔ یہاں "جلوۂ صبحِ ازل، تابانی شامِ ابد"، "نورِ چشمِ اولیں و نورِ چشمِ آخریں"، "باغِ بہشت" اور "نارِ جہیم" میں ایک طرح کا حقیقی تضاد بھی ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ فطری ہم آہنگی بھی۔ انھوں نے اسلامی تہذیب و تاریخ کے فطری رنگوں سے اپنی شعری کائنات کو جلوہ فگن کیا ہے۔

صنعت تجنیس

دو ایسے الفاظ کلام میں لے کر آنا جو تلفظ میں مشابہ لیکن معانی میں مختلف ہوں۔ صنف تجنیس کے بارے میں سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"البدیع" میں اس صنعت کے متعلق درج ہے کہ دو الفاظ تلفظ میں مشابہ ہوں اور معانی میں مختلف، اس کی کئی قسمیں ہیں۔" (۳۳)

اس کا استعمال کلاسیکی اُردو شاعری اور جدید عہد میں جا بجا نظر آتا ہے۔ مظہر الدین مظہر کے نعتیہ کلام میں صنعت تجنیس کا رنگ دیکھیے:

دو عالم وجد کے عالم میں ہوں گے   ہوا جب میں رواں سوئے مدینہ(۳۴)

دیکھا جو شہ ﷺ عالم کا نگر حاصل ہوئی جب معراج نظر احساس کی لذت کیا ہوگی احساس کا عالم کیا ہوگا(۳۵)

یہاں "عالم" اور "عالم" تلفظ میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور معنیاتی حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، مظہر الدین مظہر نے نہایت مہارت سے ان کا استعمال کیا ہے۔ "دو عالم وجد کے عالم میں ہوں گے"، "دیکھا جو شہ ﷺ عالم کا نگر" اور "احساس کا عالم کیا ہوگا" یہ ایک دوسرے میں پیوست بھی ہیں اور اختلاف بھی ان کا بنیادی حُسن ہے۔

صنعت ترصیع

شعرا اپنے کلام میں اندرونی قوافی استعمال کرتے ہیں۔ اس نسبت میں ترنم کی سی خوب صورتی پیدا ہوتی ہے۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"ایک مصرع موزوں کرنا، پھر اس کے مقابل دوسرا مصرع اس طریق پر لاویں کہ پہلے مصرع کا پہلا لفظ دوسرے مصرعے کے پہلے لفظ کا ہم قافیہ ہو اور آگے کے اشعار میں بھی اس طرح ہو سکتا ہے۔"(۳۶)

مظہر الدین مظہر کے ہاں بھی صنعت ترصیع کی مثالیں ملتی ہیں:

علیؓ علیم و علیؓ عالم و علیؓ معلوم علیؓ قیم و علیؓ قاسم و علیؓ مقسوم(۳۷)

علیؓ خبیر و علیؓ مخبر و علیؓ ہے خبر علیؓ نظیر و علیؓ ناظر و علیؓ ہے نظر(۳۸)

علیؓ شہید و علیؓ شاہد و علیؓ مشہود علیؓ وجود و علیؓ واجد و علیؓ موجود(۳۹)

کلام مظہر الدین مظہر میں "علیم، عالم، معلوم"، "قیم، قاسم، مقسوم"، "خبیر، مخبر، خبر"، "نظیر، ناظر، نظر"، "شہید، شاہد، مشہود" اور "وجود، واجد، موجود" جیسی لفظیات کی فکری و معنوی صورت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ عربی و فارسی زبان پر اپنی مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہاں فاعل، فعل اور مفعول کا استعمال بڑی مہارت سے کیا ہے۔

رعایت لفظی

اس میں شاعر ایک چیز کی نسبت سے دوسری چیز لاتا ہے۔ غیر مانوس الفاظ و محاورات اور بھاری بھرکم الفاظ و تراکیب کے ذریعے قاری کو متاثر کرنا لفاظی کہلاتی ہے۔ رعایت لفظی کے بارے میں سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

"مشرق کی ادبی روایت میں پر تکلف عبارت کا پہلا امتیاز الفاظ کی ایک ایسی ترتیب ہے جس میں سادگی بے تکلفی اور بے ساختگی کو فطری اور تصنع کے رشتے میں جوڑنا ہے، اس کا نام رعایت لفظی ہے۔"(۴۰)

مظہر الدین مظہر کے کلام میں رعایتِ لفظی کی دلکش تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ان کے کلام میں طور وایمن کی رعایت سے حضرت موسیٰؑ، آفتاب کی رعایت سے آب وتاب اور گلشن کائنات کے توسط سے رنگ ونور کا لفظ آیا ہے۔انھوں نے "بدن کے لیے دہن، زبان اور لب"، آفتاب کے لیے "طلوع، مغرب"، اور مکاں کے لیے "مکیں" کے الفاظ کو نہایت سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے کلام کی زینت بنایا ہے۔ان کے یہاں فطرت سے قربت اور تہذیبی شائستگی کا احساس قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے:

جب تک بدن جان، دہن میں زباں رہے　　لب پر ثنائے خواجہ ﷺ کون و مکاں رہے(۴۱)
فرمائیں تو طلوع ہو مغرب سے آفتاب　　چاہیں تو اک اشارے سے شق قمر کریں (۴۲)
کوثر و خلد و سبیل، تیرے وجود کی دلیل　　تیرے ہی بحر جود کی موج ہیں لوح اور قلم(۴۳)
مکان اللہ اللہ مکیں اللہ اللہ　　دیارِ عرب کی زمیں اللہ اللہ(۴۴)

کلام مظہر الدین مظہر کا معنیاتی دائرہ سماجی حد بندیوں کو توڑ کر تہذیبی و مذہبی رعنائیوں اور روحانی قربتوں کا عرفان حاصل کرتا ہے۔اس کے جمالیاتی رنگ میں اسلامی تہذیب وتاریخ کا مذہبی نظامِ حیات اپنا عکس بکھیرتا نظر آتا ہے۔

شاعرانہ تعلی

نعت میں عاجزی وانکساری کی کافی مثالیں ملتی ہیں لیکن کچھ مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں نعت گو شعرا نے اپنی نعتیہ شاعری پر فخر کا اظہار کیا ہے اور وہ اس لیے فخر کرتے ہیں کہ اللہ نے انھیں ایک نیک مقصد کے لیے چن لیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی تعریف وتوصیف بیان کرنا ان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔یوں یہ فخر تکبر والا نہیں بلکہ شکر کے اظہار والا ہے۔مظہر الدین مظہر کی نعتیہ شاعری میں تعلّی کے موضوع پر بہت سے اشعار ملتے ہیں:

یہ فیضان ہے ایک امی لقب کا　　کہ مظہر کا رنگِ بیاں محترم ہے(۴۵)

یہاں مظہر الدین مظہر اپنی فنی وفکری برتری کا اظہار کرتے ہیں کہ نعتیہ شاعری پر ان کی گرفت مضبوط ہے :

یوں تو ہمیں نعت کے اسلوب ہزاروں لیکن　　طرحِ نو میری ہے، یہ رنگِ دگر میرا ہے(۴۶)
جس میں، میں نے کوئی نعت تازہ لکھی　　وہ زمیں شعر کی آسمان بن گئی(۴۷)

آپ سچے عاشق رسول ﷺ ہیں۔آپ کو اپنی اس والہانہ عقیدت اپنے جذبوں، عقیدتوں اور قلبی وارداتوں پر

اعتماد تھا۔آپ کا یہ اظہارِ محبت عقیدت و احترام،سچائی و پاکیزگی پر مبنی ہے۔

سہل ممتنع

عام فہم اور آسان زبان میں مظہر الدین مظہر نعت کہتے ہیں۔مظہر الدین مظہر کی نعتیہ شاعری میں سہل ممتنع کی وجہ سے معنویت پیدا ہوئی ہے۔مولانا حسرت موہانی سہل ممتنع کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"سہل ممتنع سادگی وحسنِ بیان کی اس صفت کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لیے آسان ہے مگر جب کوشش کر کے ایسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے۔"(۴۸)

کلام مظہر الدین مظہر میں زبان کی صداقت اور بیان کی سچائی،ان کی سادہ بیانی اور سہل ممتنع اسے جان دار اور جمال آفریں بناتی ہے:

کرم نما ہے تری ذات یا رسول اللہ ﷺ ملے فقیر کو خیرات یا رسول اللہ(۴۹)

اے سید سرورانِ عالم ھادیٔ پیمبرانِ عالم(۵۰)

دل تک پہنچا، جہاں تک پہنچا ان کا درد کہاں تک پہنچا(۵۱)

جب ذکرِ رسول ﷺ ہو رہا تھا رحمت کا نزول ہو رہا تھا(۵۲)

پڑھو درودِ بہ آلِ محمد ﷺ عربی نصیب ہو گا وصال محمد عربی(۵۳)

مظہر الدین مظہر کے ان درج بالا اشعار میں "سید سرورانِ عالم"، "ھادیٔ پیمبرانِ عالم"، "ذکرِ رسول ﷺ"، "وصالِ محمد ﷺ عربی" اور "آلِ محمد ﷺ عربی" جیسی مفرس و معرب اور معنی خیز تراکیب استعمال ہوئی ہیں لیکن وہ اسے اس فکری آگہی،سلاست و روانی اور مترنم صورت میں اپنے کلام کا حصہ بناتے ہیں کہ کہیں بھی قاری کو اکتاہٹ اور گرانی کا احساس نہیں ہوتا۔

تکرار لفظی

مظہر الدین مظہر کے کلام میں تکرار لفظی کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔سید عابد علی عابد "البدیع" میں تکرار لفظی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حسرت موہانی نے معائبِ سخن میں ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے جو متفق علیہ نہیں ہیں یا جن کے عیوب ہونے کے متعلق مستند کتابیں کوئی ذکر نہیں رکھتی۔ایسی ہی باتوں میں تکرار لفظی بھی ہے۔اس کے متعلق ان کا موقف یہ

ہے کہ الفاظ اور حروف کی تکرارِ عام اس سے کہ وہ شعر کے ایک مصرعے میں ہوں یا دونوں میں، خوب صورتی کا باعث بنتی ہیں۔"(۵۴)

کلام مظہر الدین مظہر میں "قریہ قریہ"، "عالم عالم"، "بستی بستی"، "ذرہ ذرہ"، "جہاں جہاں" اور "قطرہ قطرہ" جیسے الفاظ ایک طرح کی موسیقیت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔اس سے ان کے اشعار میں نہ صرف روانی و تسلسل پیدا ہوا ہے بلکہ ایک طرح کی جاذبیت نے بھی جنم لیا ہے جو قاری کے دل و دماغ پر اپنا اثر جماتی ہے۔

قریہ قریہ ہے فسانہ ان کا　　عالم عالم ہے حکایت ان کی(۵۵)
میرا سینہ ٹکڑے ٹکڑے ہے غمِ شبیرؓ سے　　میرے جان و دل ہیں قربانِ شہیدِ کربلا(۵۶)
ان کا کوکب تاباں چمکا قریہ قریہ بستی بستی　　بستی بستی عالم عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم(۵۷)
وہیں وہیں دل دیوانہ ٹوٹ گیا　　جہاں جہاں بھی ملا نقشِ پائے آلِ رسول ﷺ(۵۸)
قطرہ قطرہ ہے مدینے کا حریف تسنیم　　ذرہ ذرہ در شہوار نظر آتا ہے(۵۹)

مظہر الدین مظہر کے تمام شعری مجموعوں "میزاب"، "تجلیات"، "بابِ جبرئیل"، "جلوہ گاہ" اور "نور و نار" میں تکرارِ لفظی کی عمدہ ترین مثالیں ملتی ہیں۔انھوں نے اپنے نعتیہ کلام کو فکر انگیز اور اثر انگیز بنانے کے لیے اس کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔

طویل اور مختصر بحریں

کلام مظہر الدین مظہر میں مختصر اور طویل بحروں کا استعمال اس میں جذباتیت و صداقت کا رنگ بھر دیتا ہے جس سے ان کے نعتیہ کلام میں حُسن اور رنگینی پائی جاتی ہے۔انھوں نے جہاں جہاں بھی اپنے شعری مجموعوں "میزاب"، "تجلیات"، "بابِ جبرئیل"، "جلوہ گاہ"، اور "نور و نار" میں طویل بحروں کا استعمال کیا ہے اس سے موسیقیت پیدا ہوئی ہے، مختصر بحور میں بھی ان کی قادر الکلامی صاف دکھائی دیتی ہے۔

ان کی آمد کے پھر تذکرے چھڑ گئے، ذکر میلاد پھر دل لبھانے لگا
گلستاں گلستاں پھر بہار آ گئی، پھر چمن کا چمن مسکرانے لگا (۶۰)
میں تصدق ہوں اب تو تمنا بھی یہی ایک حسرت ہے دل میں یہی آخری
میری فریاد ہو اور گلی آپ کی آپ کا شہر ہو اور دل زار ہو (۶۱)

آج ہے جشن میلاد خیر الوریٰ آج بزمِ جہاں کا سماں اور ہے
اس جگہ ذکر ہے شاہِ لولاک ﷺ کا یہ زمیں اور ہے یہ سماں اور ہے(۶۲)

کیا مستی و کیف کا سماں تھا جب میں رہِ طیبہ میں رواں تھا(۶۳)
دل خدائے سید ابرار ہے جاں نثارِ احمد مختار ہے(۶۴)

قوافی اور ردیفوں کا برمحل استعمال

کلامِ مظہر الدین مظہر میں قوافی اور ردیف کے برمحل استعمال سے ان کی نعتیہ شاعری فکر انگیز اور معنویت سے بھرپور ہے۔ مظہر الدین مظہر کی نعتوں میں ردیف حضور، اللہ، مکی مدنی، محمد عربی، سبحان اللہ وغیرہ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "لامکاں میں بھی ضوفشاں ہیں حضور ﷺ"، "مرحبا حُسن و جمال شہ مکی مدنی"، "عالم قدس کی ضیا صل علی محمد ﷺ" یہ بظاہر تو آسان قوافی و ردیف لگتے ہیں مگر ان کا بحروں میں استعمال انتہائی مشکل ہے۔

لا مکاں کے بھی رازداں ہیں حضور ﷺ لا مکاں میں بھی ضوفشاں ہیں حضور ﷺ (۶۵)
راحتِ جاں ہے خیالِ شہِ مکی مدنی مرحبا حسن و جمالِ شہ مکی مدنی(۶۶)
حرم کی زمیں اور دور اللہ اللہ کہاں ہے دل نا صبور اللہ اللہ(۶۷)
لب پہ ذکر شہِ ابرار ہے سبحان اللہ دیدنی عالم انوار ہے سبحان اللہ(۶۸)
جلوۂ نور کبریا صلی علی محمد ﷺ عالم قدس کی ضیا صلی علی محمد ﷺ (۶۹)

ان مذکورہ اشعار میں "اللہ اللہ"، "صل علیٰ محمد ﷺ"، "مکی مدنی"، "رازداں ہیں"، "ضوفشاں ہیں"، "ابرار"، "انوار"، "خیال شہ" اور "جمالِ شہ" جیسے ردیف و قوافی کے استعمال نے ان کے ہاں مترنم صورت حال پیدا کر دی ہے۔ وہ بڑی مہارت اور الفاظ کے دروبست سے فکر و معنیٰ میں تہذیبی آہنگ پیدا کرتے ہیں۔

منظر کشی

مظہر الدین مظہر کی نعتیہ شاعری میں منظر کشی کا شگفتہ انداز اور ایک خاص رنگ ہے جو تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ سوز و گداز، عظمتِ رسول ﷺ، عادات و خصائل نبی ﷺ، عقیدت و محبت، سوز و آہنگ آپ کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ میلاد مصطفیٰ، شب معراج مدینے سے والہانہ عقیدت اور تذکرہ مقدس مقامات کے مناظر دیکھیے:

نور کے جلووں میں لپٹی ہے فضا آج کی رات　　سیر کو نکلا ہے اک ماہِ لقا آج کی رات(۷۰)
اب بھی فضائے مدینہ ہے وجد میں　　سوزِ بلال اب بھی اذانِ سحر میں ہے(۷۱)
انبیاؑ منتظرِ دید کھڑے ہیں خاموش　　چشم بر راہِ محمد ہے خدا آج کی رات(۷۲)

خوب صورت لفظیات کا برمحل استعمال

دراصل خوب صورت لفظیات میں شاعری انسان کے احساسات و جذبات، خیالات اور فطری جذبوں کے لفظی اظہار کا نام ہے؟ لفظی اظہار کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ انسان کی فطرت میں ہے جب الفاظ خوب صورت ہوں، جاندار ہوں اور متاثر کن ہوں تو سننے والے کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ اپنے کلام کو خوب صورت اور دلکش بنانا ہر شاعر کی خواہش ہوتی ہے۔ مناسب الفاظ جب تک خاص سلیقے سے پیش نہ کیے جائیں کلام خوب صورت نہیں ہوسکتا۔ سجاد باقر رضوی لانجانس کی بابت لکھتے ہیں:

"حسین الفاظ خیال کے لیے روشنی کا کام دیتے ہیں۔"(۷۳)

مظہر الدین مظہر نے اپنی نعتیہ شاعری میں مناسب الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ پوری طرح شعر کے جملہ رموز سے آگاہ تھے۔

خود دار و خود شناس و خود آگاہ و خود فکر　　حق بین و حق نما و حق آثار السلام(۷۴)
حریمِ دل میں رہیں یا حریمِ جاں میں رہیں　　ہے اختیار انھیں چاہے جس مکاں میں رہیں (۷۵)
ہے تیرے لطف پر نظر لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم　　اے شہِ کشورِ عرب! اے شہِ ﷺ کشورِ عجم(۷۶)

ان کی قادر الکلامی کا اندازہ خود دار و خود شناس، خود آگاہ، خود فکر، حق بیں و حق نما و حق آثار السلام، حریم دل، حریم جاں، لحظہ بہ لحظہ، دم بہ دم، شہِ کشورِ عرب اور شہ کشورِ عجم جیسی دیدہ زیب اور معنویت سے بھرپور لفظیات سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہر شاعر اپنی شاعری کو خوب صورت بنانے کے لیے تراکیب کا سہارا لیتا ہے۔ مظہر الدین مظہر کی لفظیات اور تراکیب کے چناؤ میں جو معنوی حُسن جھلکتا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا حسیاتی شعور پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ ان کے کلام میں کئی معنیاتی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ وہ اپنی شیریں و شگفتہ زبانی سے اسے اور بھی پُرلطف بنا دیتے ہیں۔ ان کے ہاں کہیں بھی ناامیدی و مایوسی کا شائبہ تک نہیں ہوتا بلکہ سرمستی و نشاط کا انداز نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض مجید مظہر الدین مظہر کی زبان و بیان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"مظہر کی زبان شیریں وشگفتہ ہے، کیفیات پر حب رسول ﷺ کے بیان میں مایوسی کی بجائے سرمستی ونشاط کا پہلو غالب ہے، انتخاب واستعمال الفاظ میں وہ صنف نعت کی فنی نزاکتوں کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ان کے ہاں سادگی اور بے ساختگی کا رنگ نمایاں ہے، کہیں کہیں علمی انداز بھی ملتا ہے۔"(۷۷)

یقیناً مظہر الدین مظہر نے صنفِ نعت کی فنی نزاکتوں اور روحانی کیفیتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے الفاظ و تراکیب کے انتخاب میں سمجھ داری سے کام لیا ہے۔ بہرکیف مدحتِ رسول ﷺ میں دل وروح کو سرشار کر دینے والا یہ انداز عصر حاضر کے کئی اُردو شعرا پر انھیں برتری دلانے کے لیے کافی ہے۔

محاکات نگاری

مظہر الدین مظہر بے جان چیز میں جان ڈال دیتے ہیں۔وہ اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی خوب صورتی سے مجرد کو مجسم کیا ہے جو قابل تحسین ہے۔ "نثار کرتا ہے مہتاب رات کو جلوے"، "صبا جو لائی مدینے سے ان کی بوئے بدن" اور "ہے بہت قریب شاید شہِ دیں کا آستانہ" ان مصرعوں میں عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ مظہر الدین مظہر کا محبوبِ الٰہی ﷺ سے یہ فطری عشق ان کے مذہبی رجحان اور اسلامی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

نثار کرتا ہے مہتاب رات کو جلوے ہمیشہ چومتی ہے منہ سحر مدینے کا(۷۸)
صبا جو لائی مدینے سے ان کی بوئے بدن تو ہم لپٹ کے بہت دامن صبا سے ملے(۷۹)
ہے خموش نبض ہستی ہے رُکا رُکا زمانہ ہے بہت قریب شاید شہِ ﷺ دیں کا آستانہ(۸۰)

لف ونشر

مظہر الدین مظہر نے اپنے نعتیہ کلام میں صنعتِ لف ونشر کا استعمال کیا ہے۔اس صنعت کے بارے میں سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"لف سے مراد ہے کہ چند چیزوں کا ذکر کیا جائے اور نشر کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کے مناسبات کو بغیر تعین کے بیان کریں۔"(۸۱)

بہار گلشن عالم ہے ان کے جلووں سے گلوں میں رنگ نبی ﷺ ہے چمن میں بوئے رسول ﷺ (۸۲)

صنعت سوال وجواب

کلام مظہر الدین مظہر میں صنعت سوال وجواب ان کے جمالیاتی شعور کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔اس

صنعت کے بارے میں نثار اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"شعر میں سوال بھی ہو اور جواب بھی، کبھی کبھی ایک ہی مصرع میں سوال و جواب ہوتا ہے۔" (۸۳)

مظہر الدین مظہر اپنے کلام میں خود ہی سوالات اٹھاتے ہیں اور خود ہی اس کا خوب صورت اور بامعنی جواب دیتے ہیں۔ مثلاً "کسی رنگین و رعنا جادہ و منزل کو کیا دیکھیں کہ ہم ہیں سید ذی شان کا روضہ دیکھنے والے" اور "جبیں شوق ہے اور نقشِ پائے آلِ رسول ﷺ" میں کتنی خوب صورتی سے سوال اُٹھا کر ان کا معنوی تاثر سے بھرپور انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ اس سے ان کی اُردو شاعری پر فکری و فنی چابک دستی اور گرفت صاف نظر آتی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

کسی رنگین و رعنا جادہ و منزل کو کیا دیکھیں؟ کہ ہم ہیں سید ذی شان کا روضہ دیکھنے والے (۸۴)

یہ کیا مقام محبت ہے، کون سی منزل؟ جبیں شوق ہے اور نقشِ پائے آلِ رسول ﷺ (۸۵)

کس نے تیری منزل دیکھی؟ کون ترے عرفان تک پہنچا؟ (۸۶)

جو دل میں درد ہے وہ قابل بیاں بھی نہیں جو داغ سینے میں ہیں کس طرح ہو ان کا شمار؟ (۸۷)

کلام مظہر الدین مظہر میں فکری و فنی حوالے سے ہم آہنگی اور ارتباط کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا طرزِ بیان نہایت شگفتہ اور زبان شائستہ ہے۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات، محاورات و تراکیب اور صنائع و بدائع کے استعمال میں سلیقہ شعاری کا ثبوت دیا ہے۔ وہ معنی خیز لفظیات کو وجدانی رنگ میں اپنے فکر و شعور کا حصہ بناتے ہیں جس سے روحانی جلال و جمال جنم لیتا ہے۔ گوہر ملیسانی مظہر الدین مظہر کے نعتیہ کلام میں ان فنی خصوصیات کے بارے لکھتے ہیں:

"مظہر کا طرز بیان شگفتہ اور شائستہ ہے۔ ان کے الفاظ و تشبیہات میں ایک قرینہ پایا جاتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب حسین سے حسین تر ہے اور الفاظ کا سلیقہ ایک وجد آفرین کیفیت کا حامل ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی الفاظ پرشکوہ ہیں۔ کسی عظیم خیال کے لیے جمیل و جلیل الفاظ کا ہونا بھی ضروری ہے جو بیان کو حسن عطا کرتے ہیں۔" (۸۸)

ان درج بالا فکری و فنی مباحث سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ مظہر الدین مظہر ۲۰ ویں صدی میں اردو نعت کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے ہاں قدیم شعری روایت کی پاسداری ملتی ہے اور جدت کی رنگینی بھی، حب رسول ﷺ کی خوشبو بھی ہے اور ملت اسلامیہ کا درد بھی، نبی ﷺ کے شہر میں گزری ہوئی ساعتوں کا تذکرہ بھی ہے اور ہجر مدینہ کی پُرکیف کیفیتوں کا اظہار بھی، صحابہؓ و اہل بیتؓ اور غلامانِ رسول ﷺ سے محبت کا اظہار بھی ہے اور نبی ﷺ

کے دشمنوں سے نفرت اور بیزاری کا اعلان بھی، صنعتوں کا خوب صورت استعمال بھی ہے اور زبان و بیان کی رعنائی بھی۔ الغرض عصر حاضر میں ان کی نعت فکر و فن کے حوالے سے ایک فکر انگیز ادبی شاہکار ہے۔ ان کی نعت کی مثال ایک ایسے باغ کی سی ہے جس میں ہر رنگ کا پھول کھلا ہوتا ہے۔ جس کی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے اور ہر کوئی اس کی خوشبو سے مستفید ہوتا ہے۔

حوالہ جات

(۱) رشید احمد صدیقی، "جدید غزل"، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، 1979ء، ص24

(۲) مظہر الدین مظہر، "جلوہ گاہ" (واپسی، حصہ چہارم)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، (مرتب: ارسلان احمد ارسل)، لاہور: ارفع پبلشرز، ۲۰۱۳ء، ص872

(۳) "جلوہ گاہ" (آرزوئیں، حصہ اول)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص683

(۴) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص503

(۵) ایضاً، ص661

(۶) "جلوہ گاہ" (حدیثِ کربلا)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص908

(۷) "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص963

(۸) "جلوہ گاہ" (آغازِ سفر، حصہ دوم)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص801

(۹) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص451

(۱۰) ایضاً، ص451

(۱۱) "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص1047

(۱۲) ایضاً، ص1047

(۱۳) ایضاً، ص1047

(۱۴) "جلوہ گاہ" (واپسی، حصہ چہارم)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص891

(۱۵) "جلوہ گاہ"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص668

(۱۶) "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص1087

(۱۷) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص553

(۱۸) ایضاً، ص639

(۱۹) "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص1055

(۲۰) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص572

(۲۱) ایضاً، ص477

(۲۲) "جلوہ گاہ" (آغازِ سفر، حصہ دوم)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص789

(۲۳) عابد علی عابد، سید، "البدیع"، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1985ء، ص۷۶

(۲۴) "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص1070

(۲۵) ایضاً، ص1064

(۲۶) "میزاب"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص1123

(۲۷) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص534

(۲۸) ایضاً، ص577

(۲۹) "جلوہ گاہ" (آرزوئیں، حصہ اول)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص684

(۳۰) ایضاً، ص714

(۳۱) "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص1074

(۳۲) "جلوہ گاہ" (حضوری، حصہ سوم)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص828

(۳۳) عابد علی عابد، سید، "البدیع"، لاہور : مجلس ترقی ادب، 1985ء، ص293

(۳۴) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص556

(۳۵) ایضاً، ص772

(۳۶) عابد علی عابد، سید، "البدیع"، لاہور : مجلس ترقی ادب، 1985ء، ص299

(۳۷) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص647

(۳۸) ایضاً، ص647

(۳۹) ایضاً، ص647

(۴۰) وقار عظیم، سید، "فن اور فنکار"، لاہور : اردو مرکز، 1966ء، ص91

(۴۱) "جلوہ گاہ" (آرزوئیں، حصہ اول)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص679

(۴۲) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص449

(۴۳) "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص988

(۴۴) "جلوہ گاہ" (حضوری، حصہ سوم)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص824

(۴۵) "تجلیات"،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص568

(۴۶) "جلوہ گاہ" (آغازِ سفر،حصہ دوم)،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص755

(۴۷) ایضاً،ص785

(۴۸) حسرت موہانی،مولانا،"نکات سخن"،حیدرآباد :انتظامی پریس،س ن،ص181

(۴۹) "بابِ جبرئیل"،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص1000

(۵۰) "جلوہ گاہ" (آرزوئیں،حصہ اول)،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص704

(۵۱) "تجلیات"،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص499

(۵۲) "جلوہ گاہ" (آرزوئیں،حصہ اول)،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص694

(۵۳) "جلوہ گاہ" (حضوری،حصہ سوم)،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص847

(۵۴) عابد علی عابد،سید،"البدیع"،لاہور :سنگ میل پبلی کیشنز،2011ء،ص210

(۵۵) "تجلیات"،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص533

(۵۶) ایضاً،ص659

(۵۷) ایضاً،ص468

(۵۸) ایضاً،ص578

(۵۹) ایضاً،ص619

(۶۰) ایضاً،ص549

(۶۱) ایضاً،ص604

(۶۲) ایضاً،ص522

(۶۳) "جلوہ گاہ" (آرزوئیں،حصہ اول)،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص683

(۶۴) "میزاب"،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص1155

(۶۵) "تجلیات"،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص579

(۶۶) "میزاب"،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص1151

(۶۷) "جلوہ گاہ" (آرزوئیں،حصہ اول)،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص720

(۶۸) "میزاب"،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص1160

(۶۹) "جلوہ گاہ" (آغازِ سفر،حصہ دوم)،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص790

(۷۰) "تجلیات"،مشمولہ" کلیاتِ مظہر"،ص592

(۷۱) "جلوہ گاہ" (آغازِ سفر، حصہ دوم)، ص765

(۷۲) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص593

(۷۳) سجاد باقر رضوی، "مغرب کے تنقیدی اصول"، لاہور : اظہار سنز 1971ء، ص122

(۷۴) "تجلیات"، مشمولہ "کلیات مظہر"، ص652

(۷۵) ایضاً، ص ۶۵۲

(۷۶) "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص958

(۷۷) ریاض مجید، ڈاکٹر، "نعت گوئی کا رنگ دگر"، مشمولہ، سہ ماہی "مدحت"، لاہور : طٰہٰ پبلی کیشنز، جون تا ستمبر ۲۰۱۰ء، ص160

(۷۸) مظہر الدین مظہر، "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیات مظہر"، ص1012

(۷۹) ایضاً، ص965

(۸۰) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص623

(۸۱) عابد علی عابد، سید، "البدیع"، لاہور : مجلس ترقی ادب 1985ء، ص248

(۸۲) "تجلیات"، مشمولہ "کلیات مظہر"، ص731

(۸۳) نثار اکبر آبادی، "شعر اور فنِ شعر"، لاہور : دبستان شعر و ادب، 2002ء، ص63

(۸۴) مظہر الدین مظہر، "بابِ جبرئیل"، مشمولہ "کلیات مظہر"، ص1071

(۸۵) "تجلیات"، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص578

(۸۶) ایضاً، ص500

(۸۷) "جلوہ گاہ" (حضوری، حصہ سوم)، مشمولہ "کلیاتِ مظہر"، ص837

(۸۸) گوہر ملیسانی، "عصرِ حاضر کے نعت گو"، لاہور : کتاب سرائے، 1983ء، ص127

***

Editorial Board

Iftikhar Arif, Ex,DG, Idara e Forogh e Urdu Pakistan,Islamabad

Dr. Muhammad Saleem Akhtar, Ex Honorary Editor, Pegham-e-Ashna

Dr. Hilal Naqavi,Pak Study Centre, Karachi University, Karachi

Dr.Mehr Noor Mohammad Khan, Ex-Chairperson، Dept.of Persian NUML, Islamabad

Dr. Mohammad Yousaf Khushk, Chairperson Academy of letters Pakistan, Islamabad

Dr. Shugufta Mosavi, Ex HOD, Persian Department, NUML, Islamabad

HOD, Persian Department, NUML, Islamabad**Dr. Ambar Yasmeen,**

Advisory Board

Dr.Ibrahim Mohammad Ibrahim, Chairperson، Dept.of urdu, Al Azhar University, Egypt

Dr. Haider Raza Zabit, Islamic Research Centre, Astan-e-Quds Rizvi, Mashad, Iran

Dr.Khalil Tauq Aar, Chairperson،Dept,.of urdu Ankara University, Istanbul, Turkey

Prof.Sahar Ansari, Anjuman Taraqi e Urdu , Karachi.

Dr.Abdullah Jan Abid,Chairperson، Department of Pakistani Languages, AIOU,Islamabad

Dr. Iraq Raza, Chairperson Dept.of Persian Jamia Milia Islamia, Dehli, India

Dr. Ali Bayat, Chairperson Dept.of urdu, Tehran University, Tehran, Iran

Dr. Maqsood Ilahi Sheikh, Research Scholar, Bradford, England

Dr. Mohammad Nasir, Chairperson Dept.of Persian, Oriental College, UoP, Lahore

Dr. Najeeba Arif, Deen, IIUI, Islamabad.

PAYGHAM-E-ASHNA

ISLAMABAD - PAKISTAN

Vol. 22, S.No.88

(July to September) 2022

Chief Editor

Ehsan Khazaei

Editor

Dr. Ali Kumail Qazalbash

Cultural Consulate

Embassy of Islamic Republic of Iran, Islamabad

House No. 25, Street No 27, F-6/2, Islamabad, Pakistan

Ph:051 2827937-8 Fax: 051 2821774

Email: iran.council@gmail.com, payghameashna@gmail.com

ur.icro.ir/IslamAbad// Web: http:

ISSN: 2079-4568

Payghame-e Ashna

VOL. 22, S.NO. 88
(JULY TO SEPTEMBER) 2022

زیر نظر فرهنگی سفارت جمهوری اسلامی ایران - اسلام آباد

ISSN: 2079-4568